ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

☆ اسلامی شریعت میں اجتہاد کا عمل
سید جلال الدین عمری
☆ امام ابوحنیفہ اور اصولِ فقہ
ڈاکٹر حافظ عبداللہ
☆ وحی پر مبنی دین
مولانا محمد جرجیس کریمی
☆ حالی کی مذہبی فکر پر مغرب کا اثر
ڈاکٹر محمود حسن الہٰ آبادی
☆ بیسویں صدی میں تجدیدی تحریکات اور علماء
پروفیسر احتشام احمد ندوی
☆ اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی
جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف
☆ تبصرے

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی
نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۰۹ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

Website: www.tahqeeqat-e-islami.co.in

سہ ماہی **تحقیقاتِ اسلامی** علی گڑھ

جلد: ۲۸ شمارہ:۱

محرم ـــــــــــــــــــ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

جنوری ـــــــــــــــــــ مارچ ۲۰۰۹ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپیے
سالانہ	۱۲۰ روپیے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپیے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلامی شریعت میں اجتہاد کا عمل — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

امام ابوحنیفہؒ اور اصول فقہ — ڈاکٹر حافظ عبداللہ — ۳۱

بحث ونظر

وحی پر مبنی دین — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۴۵

حالی کی مذہبی فکر پر مغرب کا اثر — ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی — ۶۹

بیسویں صدی میں تجدیدی تحریکات اور علماء — پروفیسر اختشام احمد ندوی — ۸۹

نقد واستدراک

اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی-ایک جائزہ — جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف — ۹۷

تعارف وتبصرہ

مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۱

نقوش سیرت — مولانا مجاہد شبیر احمد فلاحی — ۱۱۴

عربی تنقید کا ارتقاء — ڈاکٹر جمشید احمد ندوی — ۱۱۶

شاہ معین الدین احمد ندوی — مولانا جاوید احسن فلاحی — ۱۱۸

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۳۰) — ۱۲۰

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر حافظ عبداللہ
اسسٹنٹ پروفیسر شیخ زاید اسلامک سینٹر، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

۲۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی
بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، بھیونڈی، مہاراشٹر

۴۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی
مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی)

۵۔ جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف
صنعاء، یمن

۶۔ مولانا مجاہد شبیر احمد فلاحی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۷۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۸۔ مولانا جاوید احسن فلاحی
۲۹-اے ڈی اے کالونی، شاہ جمال، علی گڑھ

۹۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۱۰۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

اسلامی شریعت میں اجتہاد کا عمل

سید جلال الدین عمری

جامعہ دار السلام عمر آباد نے اپنی تاسیس کے پچاس سال مکمل ہونے پر ۱۶-۱۸/اپریل ۱۹۷۷ء میں جشن طلائی منایا تھا۔ اس مناسبت سے جمعیت ابنائے قدیم جامعہ نے 'صحیفہ' کے نام سے ایک ضخیم یادگار مجلّہ شائع کیا۔ یہ مضمون اسی کے لیے جنوری ۱۹۷۷ء میں تحریر کیا گیا اور مجلّہ میں شائع ہوا۔ اب اسی کو نظر ثانی اور ضروری اضافوں کے ساتھ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ (جلال الدین)

اسلام نے شریعت کا ایک جامع اور مکمل نظام عطا کیا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی سے ہے۔ لیکن احکام شریعت مختلف نوعیت کے ہیں۔ بعض احکام اصولی قسم کے ہیں۔ ان کی تفصیلات نہیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس بعض احکام کی جزئیات اور تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں۔

اسلامی شریعت کا بڑا حصہ عبادات سے متعلق ہے۔ شریعت میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نذر، قربانی اور ان جیسی دوسری عبادات کے بارے میں جتنے تفصیلی احکام موجود ہیں، اتنے تفصیلی احکام زندگی کے کسی اور شعبہ سے متعلق نہیں ہیں۔ اس نے عبادات کی شکلیں بھی متعین کردی ہیں اور اُن کو ادا کرنے کے طریقے بھی بتادیے ہیں۔

اس کے بعد معاشرت سے متعلق احکام کی تفصیل ملتی ہے۔ معاشرت میں نکاح کی ہدایت، جائز نکاح کی شرائط، مہر، زوجین کے حقوق، نان نفقہ، ازدواجی تعلقات، طلاق، خلع، وراثت، وصیت، ہبہ، والدین اور رشتہ داروں کے حقوق جیسے امور و مسائل آتے ہیں۔

معیشت میں جائز و ناجائز کے حدود، تجارت اور زراعت سے ہونے والی آمدنی میں دوسروں کے حقوق، قرض کا جواز، احتکار، ذخیرہ اندوزی، دھوکے اور فریب کی ممانعت، سود کی حرمت جیسی تعلیمات ملتی ہیں۔ ان میں بعض کی تشریح اور وضاحت بھی پائی جاتی ہے۔

جہاں تک نظامِ سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کا تعلق ہے ان میں اسلام نے زیادہ تر اصولی ہدایات دی ہیں۔ تفصیلات سے بہت کم بحث کی ہے۔

اسلامی احکام کو اشخاص، واقعات اور حالات پر منطبق کرنے کے لیے قدم قدم پر سوجھ بوجھ اور عقل وفہم سے کام لینا پڑتا ہے، اس کے بغیر بعض اوقات چھوٹے سے چھوٹے حکم پر بھی عمل نہیں ہوسکتا۔ نماز فرض ہے، اسے قبلہ رُو ہوکر ادا کرنا چاہیے، اس کے اوقات بھی معلوم ہیں، لیکن اس کا فیصلہ انسان کی عقل کرتی ہے کہ سمتِ قبلہ کیا ہے؟ کس نماز کا وقت کب شروع ہوتا اور کب ختم ہوتا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے، لیکن یہ طے کرنا بیش تر صورتوں میں انسان کا اپنا کام ہے کہ کون فرد اس کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے؟ اسے انفرادی طور پر خرچ کرنا چاہیے یا کسی ادارے کو اس کا ذریعہ بنانا چاہیے؟

یہ بہت چھوٹی مثالیں ہیں، جن کو تھوڑی سی سوجھ بوجھ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ پیچیدہ مسائل گہرے غور وفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حکم ہے کہ اہم معاملات طے ہوں تو گواہ مقرر کیے جائیں (البقرہ:۲۸۲)۔ اختلاف کی صورت میں گواہوں کے بیان پر فیصلہ ہوگا، لیکن یہ طے کرنا قاضی کا کام ہے کہ شہادت دینے والوں میں کون سچا ہے اور کون جھوٹ بول رہا ہے؟ کس کی شہادت کس معاملہ میں قبول کی جاسکتی ہے اور کس کی شہادت قابل رد ہے؟ ظاہر ہے، یہ نسبتاً پیچیدہ کام ہے۔

اسلام نے معاشرتی مسائل کے ذیل میں جگہ جگہ 'معروف' کے مطابق عمل کی ہدایت کی ہے، چناں چہ ایک جگہ اس نے کہا کہ عورت کے ساتھ معروف کے مطابق سلوک ہونا چاہیے (النساء:۱۹)۔ اس میں نان نفقہ بھی شامل ہے، لیکن اس نے اس کی

حد بندی نہیں کی۔ یہ اشخاص کے اختلاف سے بھی، معاشروں کے اختلاف سے بھی اور زمانہ کے اختلاف سے بھی بدل سکتا ہے۔ ان بدلتی ہوئی صورتوں کے لحاظ سے اس کا تعین کرنا ایک 'اجتہادی عمل' ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے کہا کہ مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں (الشوری: ۳۸) اس مشورے کی صورت کیا ہوگی؟ کیا سب مسلمان اس میں شریک ہوں گے یا ان کے نمائندوں سے مشورہ ہوگا؟ کن اُمور میں کس سے مشورہ ہوگا؟ ان سوالات سے اُس نے تعرض نہیں کیا ہے، اُس کی جو بھی صورت اختیار کی جائے گی وہ 'اجتہادی' ہوگی۔

یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں اسلام کے صریح احکام موجود ہیں۔ بہت سے معاملات میں اس نے واضح ہدایات ہمیں نہیں دی ہیں۔ ان میں اس کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ہمیں قیاس اور اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر دور اول میں کاروبار اور لین دین کی جو صورتیں رائج تھیں، ان میں سے بعض کو اس نے جائز اور بعض کو ناجائز قرار دیا۔ اب بہت سی ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں جو اس وقت نہیں تھیں۔ ان میں جو صورتیں ناجائز صورتوں سے مشابہ ہوں گی ان کو ناجائز کہا جائے گا اور جو صورتیں جائز صورتوں سے ملتی جلتی ہوں گی اُن کو جائز قرار دیا جائے گا۔ بعض اوقات اسلام صرف اصولی ہدایات دیتا ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے منشا کو سمجھ کر تفصیلات طے کرنا اس کے ماننے والوں کا کام ہے۔ اس نے ظلم وعدوان سے منع کیا ہے اور عدل واحسان کا حکم دیا ہے، لیکن اس نے ظلم اور عدل کی ساری شکلوں کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا ظلم یا عدل ہونا واضح ہے اور کچھ چیزوں کے بارے میں اجتہاد اور غور وفکر کی ضرورت پڑے گی۔

اسلام نے ایک طرف تو انسان کو شریعت کا مکلّف بنایا اور اسے مختلف قسم کے احکام دیے، دوسری طرف اس نے کہا کہ کسی بھی شخص پر اس نے اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے (البقرۃ: ۲۸۶)۔ اس نے دین میں تنگی نہیں رکھی ہے (الحج: ۷۸) بلکہ

اسے آسان بنایا ہے۔(البقرۃ:۱۸۵) چناں چہ بہت سے معاملات میں اس نے رخصت بھی فراہم کی ہے۔ یہ دیکھنا کہ کس شخص کے لیے کون سا حکم قابلِ برداشت ہے اور کب اس کے لیے زحمت اور دشواری پیدا ہوجائے گی؟ ایک اجتہادی عمل ہے۔

حدیث میں فقہ وبصیرت کی ترغیب

احادیث میں اس کی بڑی ترغیب دی گئی ہے کہ دین میں گہری بصیرت حاصل کی جائے اور نصوص کی عدمِ موجودگی میں اجتہاد سے کام لیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین و انما انا قاسم و اللہ یعطی[1]

اللہ تعالیٰ جب کسی کے ساتھ خیر چاہتا ہے تو اُسے دین میں سوجھ بوجھ عطا کرتا ہے۔ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے۔

حدیث میں لفظ 'خیر' نکرہ استعمال ہوا ہے۔اس میں عموم پایا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کسی کو خیر کثیر یا بہت بڑی بھلائی سے نوازنا چاہتا ہے اسے دین میں فقہ وبصیرت عطا کرتا ہے۔ 'وانما انا قاسم' کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو مالِ غنیمت یا ساز وسامان آتا ہے میں اسے مستحقین کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کر دیتا ہوں۔جس کے اندر دین کی سمجھ ہوگی اسے اس پر کبھی اعتراض نہ ہوگا۔ان الفاظ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دین آیا ہے، میں اسے بلاتخصیص سب کے درمیان عام کرتا ہوں۔ جہاں تک فقہ وبصیرت کا تعلق ہے اللہ جسے جتنی دینا چاہے دیتا ہے۔ جسے یہ دولت ملی وہ خیرِ کثیر سے بہرہ ور ہوا۔

ایک اور حدیث میں اس شخص کو قابل رشک قرار دیا گیا ہے جو شب و روز قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتا ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین۔ مسلم، کتاب الزکوۃ، باب النھی عن المسئلۃ۔

لاَ حسد الّا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ القرآن فھو یتلوہ آناء اللیل و آناء النھار و رجل اٰتاہ اللہ مالاً فھو ینفقہ آناء الیل و آناء النھار۔ [۱]

رشک بس دو خوبیوں پر ہوتا ہے۔ ایک خوبی یہ کہ اللہ کسی شخص کو قرآن عطا کرے اور وہ رات اور دن کے اوقات کو اس کی تلاوت میں صرف کرے۔ دوسری قابل رشک خوبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مال عطا کرے اور وہ رات دن، ہر وقت اسے خرچ کرتا رہے۔

قرآن کی تلاوت میں اس کا پڑھنا، اس پر غور وفکر اور اس کی تعلیم وتدریس بھی شامل ہے۔ چناں چہ مسلم کی روایت میں 'فھو یقوم بہ اٰناء الیل و اٰناء النھار' کے الفاظ آئے ہیں، جس کے اندر اس پر عمل کرنے اور اس کو عام کرنے کا مفہوم بھی داخل ہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے۔ یہی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

لاَ حسد الّا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ مالاً فسلط علی ھلکتہ فی الحق، و رجل اتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلّمھا۔ [۲]

رشک تو بس دو خوبیوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اللہ کسی کو مال دے اور اسے اس کام پر لگادے کہ وہ راہِ حق میں اپنا مال صرف کرتا رہے۔ دوسری قابل رشک خوبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو حکمت دین سے نوازے اور وہ اس کے ذریعے فیصلہ کرے اور اس کی تعلیم دے۔

اس میں قابل رشک خوبی یہ قرار دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کسی پر دین کی حکمت اور اس کے اسرار و رموز کے دروازے کھول دے۔ وہ اس کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرے، اس کی تعلیم دے اور اسے عام کرے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی ایک روایت میں اجتہاد کی بڑی حوصلہ افزائی موجود

---

[۱] بخاری، کتاب التوحید، باب قول النبیؐ رجل اٰتاہ اللہ القرآن فھو یقوم بہ۔ مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا۔ باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ الخ

[۲] بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ الخ۔

ہے۔ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اصاب فلہ اجران و اذا حکم فاجتھد ثم اخطا فلہ اجر[1]

جب حاکم فیصلہ کرے، اس کے لیے کوشش کرے اور امرِ حق پالے تو اسے دو اجر ہیں۔ جب حاکم فیصلہ کرے، اس کے لیے کوشش کرے، لیکن اس کے باوجود غلطی کر جائے تو اس کا ایک اجر ہے۔

مطلب یہ کہ حاکم اپنے فیصلہ میں اجتہاد کے ذریعے صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے اور شریعت کے منشا کو پالیتا ہے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا، لیکن اگر وہ اجتہاد کے باوجود حق و صواب کو پانے میں غلطی کر جائے تو اسے اپنے اجتہاد کا ایک اجر ملے گا اور اجتہادی غلطی کا گناہ نہ ہوگا۔

یہاں حاکم سے مراد وہ حاکم ہے جو دین کا علم رکھتا ہو اور جس کے اندر متعلقہ مسئلہ میں اجتہاد کی صلاحیت پائی جائے۔ اگر کوئی شخص علم کے بغیر اجتہاد کرے گا، اس کا فیصلہ چاہے صحیح ہو، وہ کسی ثواب کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ گناہ گار ہوگا۔

اجتہاد کی تربیت

ان اصولی ہدایات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو اجتہاد کے موقعے پر اجتہاد کرنے کی ہدایت کی اور عملاً اس کی تربیت دی۔

ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، لیکن اپنی نذر پوری کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، کیا میں اُس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے اس سے پوچھا: بتاؤ اگر تمھاری ماں پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا تم اُسے ادا نہ کرتیں؟ اس نے عرض کیا: ہاں ضرور کرتی۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس قرض کو بھی ادا کرو۔ یہ تو دوسرے قرضوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ وہ ادا ہو۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب اجر الحاکم اذا اجتھد فاصاب او اخطأ۔ مسلم، کتاب الاقضیۃ، باب اجر الحاکم اذا اجتھد فاصاب او اخطأ۔

[2] بخاری، کتاب الاعتصام، باب من شبہ اصلاً معلوماً باصل مبین۔

اس طرح آپؐ نے بتایا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں بعض پہلوؤں سے مشابہت ہے اور ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جانا چاہیے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں اپنے مال کا حق ادا کرے تو یہ مال آخرت میں اس کی فلاح اور کامیابی کا ذریعہ ہوگا، لیکن جس مال کا حق ادا نہ کیا جائے وہ آخرت میں وبال ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ نے دولت کی مختلف صنفوں: سونے، چاندی، اونٹ، گائے، بکری اور گھوڑے کا تفصیل سے ذکر کیا کہ وہ کس صورت میں ہلاکت کا باعث ہوں گے اور کب سبب نجات بنیں گے؟ اس پر صحابہؓ نے گدھے اور خچر کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: اس سلسلے میں الگ سے کوئی ہدایت نہیں نازل ہوئی ہے، البتہ یہ جامع اور اپنی نوعیت کی منفرد آیت موجود ہے:

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ — جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ ۔[1] — (وہاں) وہ دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا اسے بھی وہ دیکھ لے گا۔ (الزلزال:۷-۸)

یہ درحقیقت اصول وکلیات سے تفصیلات اخذ کرنے کی ہدایت ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی صحابہؓ نے کسی معاملے میں اجتہاد سے کام لیا تو آپؐ نے اس کی ہمت افزائی فرمائی۔

جنگِ 'احزاب' کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے بعض لوگوں سے کہا کہ وہ فوراً 'بنی قریظہ' پہنچ جائیں اور وہیں عصر کی نماز پڑھیں، لیکن یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ عصر کا وقت ہوگیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ ہم 'بنوقریظہ' پہنچنے میں جلدی کریں۔ آپؐ کا منشا یہ نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے نمازِ عصر میں تاخیر کردی جائے۔ چناں چہ ان لوگوں نے وقت پر نماز پڑھ لی، لیکن بعض دوسرے لوگوں نے اس سے اختلاف کیا، چوں کہ آپ نے عصر کی نماز 'بنوقریظہ' میں پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اس لیے وہیں پہنچ کر رات میں انھوں نے نماز پڑھی، پہلے گروہ نے آپؐ کے منشا کو سمجھنے کی کوشش

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ

کی اور دوسرے گروہ نے آپؐ کے الفاظ کو سامنے رکھا، جب آپؐ کو اس کی اطلاع ملی، تو آپؐ نے کسی بھی گروہ کو ملامت نہیں کی۔[۱]

دو صحابہؓ سفر میں تھے، نماز کا وقت آیا تو وضو کے لیے پانی نہیں تھا، چناں چہ انھوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی، لیکن وقت کے ختم ہونے سے پہلے ہی پانی مل گیا، تو ایک صاحب نے نماز دہرائی اور دوسرے نے نہیں دُہرائی، آپؐ نے دونوں کو درست قرار دیا۔ جنھوں نے نماز نہیں دہرائی اُن سے کہا: تم نے سنت کے مطابق عمل کیا، تمھارے لیے یہ نماز کافی ہے، دوسرے سے کہا کہ تمھیں دوگنا اجر ملے گا۔[۲]

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے اجتہاد کے عمل کو جاری رکھا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا اس پر اجماع رہا ہے کہ جس مسئلے میں شریعت کا منصوص حکم نہ ہو وہاں رائے اور اجتہاد سے کام لیا جائے، اسی پر انھوں نے اپنے دور میں عمل کیا۔ یہ اس قدر تواتر سے ثابت ہے کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ امام غزالیؒ نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سب سے اہم مسئلہ خلافت کا پیش آیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مستحق خلافت ہونے کی ایک دلیل حضرت عمرؓ نے یہ دی کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنی زندگی میں نماز کی امامت کے لیے آگے بڑھایا تھا۔ یہ ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت تھا کہ خلافت کے لیے بھی حضرت ابوبکرؓ ہی سب سے زیادہ آپ کی نظر میں مستحق تھے۔ اس طرح انھوں نے 'امامتِ صغریٰ' پر 'امامت کبریٰ' کو قیاس کیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے 'مانعینِ زکوٰۃ' سے جنگ کرنی چاہی تو بعض صحابہؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد تھا کہ اسلام لانے کے بعد لوگوں کے جان و مال محفوظ ہیں، الاّ یہ کہ حق اس کا تقاضا کرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اُسی میں زکوٰۃ بھی داخل ہے۔ جس طرح نماز کے انکار پر جنگ کی جائے گی، اسی طرح زکوٰۃ

---

۱ بخاری، کتاب صلوٰۃ الخوف، باب صلوٰۃ الطالب والمطلوب راکباً وایماءاً، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب

۲ ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی المتیمم یجد الماء، دارمی، کتاب الطہارۃ، باب التیمم

کے انکار پر بھی جنگ کی جائے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا ایک ساتھ اور یکساں اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں خلیفۂ وقت رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ رفاہِ عام کے لیے لی تھی، اس مقصد کے لیے آپؐ کے بعد بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ اس طرح یہ پورا مسئلہ اجتہادی تھا۔

صحابہؓ کے وظائف متعین ہوئے تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اُن کی دینی خدمات اور قربانیوں کے لحاظ سے اُن کے وظائف متعین کیے جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: یہ خدمات اور قربانیاں اللہ کے لیے انجام دی گئی تھیں، اس کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا۔ دنیا کی ضروریات سب کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اس لیے اس معاملے میں برابری ہونی چاہیے، چناں چہ انھوں نے بغیر کسی فرق کے سب کا ایک وظیفہ مقرر کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اس فیصلے کو بدل دیا اور دینی خدمات اور قربانیوں کے لحاظ سے وظائف کا تعین کیا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد تھا اور یہ حضرت عمرؓ کا۔

امام غزالیؒ نے اس قسم کے اور بھی اجتہادات نقل کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو اُن کے اجتہادات میں سے صرف چند ہیں، سب کا نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔[1]

فتویٰ دینے والے صحابہ

جن صحابۂ کرامؓ نے مختلف موضوعات پر فتوے دیے ان کی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) سے زیادہ ہے، ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں ابومحمد بن حزمؒ کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے فتوؤں سے ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ ابوبکر محمد بن موسیٰؒ نے صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتوؤں کے بیس مجموعے مرتب کیے تھے۔ ان کے علاوہ بیس صحابہ وہ ہیں جنھوں نے اتنے زیادہ فتوے تو نہیں دیے، لیکن پھر بھی ان میں سے ہر ایک کے فتووں سے ایک رسالہ تیار ہوسکتا ہے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ

[1] ملاحظہ ہو غزالی، المستصفیٰ: ۲/ ۲۴۱، ۲۴۲، المطبعۃ الامیریۃ بولاق مصر، ۱۳۲۴ھ، طبع اول

وغیرہ داخل ہیں۔ باقی صحابہؓ نے بہت کم فتوے دیے ہیں۔ کسی نے ایک مسئلے میں، کسی نے دو مسئلوں میں، کسی نے کچھ زیادہ مسائل میں فتوے دیے۔ ان سب فتووں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک مختصر سا مجموعہ تیار ہوسکتا ہے۔[۱]

تابعینؒ میں بھی بڑے بڑے فقہا پیدا ہوئے۔ صرف مدینے میں بیک وقت سات فقہاء تھے۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، یمن، خراسان اور دوسرے علاقوں میں فقہاء کی بڑی تعداد تھی جنھوں نے ان صحابہؓ کے ساتھ ایک مدت گزاری، جن کی کتاب وسنت پر گہری نظر تھی اور جو اجتہاد و استنباط کر سکتے تھے۔ ان سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا اور فتویٰ دینے اور اجتہاد کرنے کی تربیت حاصل کی۔ خود اکابر صحابہؓ نے اُن کے علم وفضل کی تعریف کی۔ ان میں اصحابِ درس بھی تھے، جن کے طالب علموں اور شاگردوں کا بڑا وسیع حلقہ تھا۔ ان میں مفتی بھی تھے، جن کی طرف دینی احکام معلوم کرنے کے لیے لوگ رجوع کرتے تھے۔ ان میں قاضی بھی تھے، جن کو مختلف مسائل کے سلسلے میں کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلے کرنے پڑتے تھے۔

غرض سینکڑوں تابعینؒ ہیں، جن کو مورخین نے مفتی، مجتہد، فقیہ اور عالم کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان میں سے بعض افراد تو اپنے علم وفہم، فقہی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ میں سب سے بڑے راوی حدیث ہیں۔ حضرت سعید ابن مسیّبؒ ان کے داماد تھے۔ انھوں نے سب سے زیادہ ان کی حدیثیں روایت کی ہیں۔ دوسرے صحابہؓ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فتاویٰ اور صحابہ کے اسوہ سے سب سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے، خصوصیت سے حضرت عمرؓ کے علم کے حامل سمجھے جاتے تھے، خود بھی فقیہ تھے، امام زہریؒ نے اُن کو سب سے بڑا فقیہ کہا ہے۔[۲]

فقہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مقام بہت نمایاں ہے۔ حضرت علقمہؒ کا ان

---

۱ ابن قیم، اعلام الموقعین: ۱/ ۱۹، دارالکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۶ء

۲ ابن قیم، اعلام الموقعین: ۱/ ۱۸

کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ خاص طور پر فقہ میں انھوں نے ان سے تربیت حاصل کی تھی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جتنا کچھ میں جانتا ہوں اتنا علقمہؒ بھی جانتے ہیں، اور جو کچھ میں پڑھ سکتا ہوں وہ علقمہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ انھوں نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابودرداءؓ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ قابوس بن ظبیانؒ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے پوچھا: کیا بات ہے کہ آپ صحابہؓ کو چھوڑ کر علقمہؒ کی مجلس میں پہنچ جاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بھی علقمہؒ سے مسائل معلوم کرتے اور فتویٰ حاصل کرتے تھے۔[۱]

امام شعبیؒ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ جیسے صحابہؓ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔ ان کو ذہبیؒ نے 'علامۂ تابعین' کہا ہے۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ اُن کے دور میں بہت سے صحابہؓ تھے لیکن اس کے باوجود اُن سے فتوے لیے جاتے تھے۔ ان کا اپنا ایک حلقہ تھا۔ جہاں تک قیاس اور اجتہاد کا تعلق ہے، ابراہیم نخعیؒ کا مقام اُن سے بھی اونچا تھا۔ ابن عونؒ کہتے ہیں: شعبیؒ خوش مزاج اور ہنسنے بولنے والے آدمی تھے، لیکن کوئی فتویٰ سامنے آتا تو وہ خاموش ہو جاتے، اس کے برخلاف ابراہیم نخعیؒ خاموش طبع تھے، لیکن فتویٰ دیتے وقت اُن کی خاموشی ختم ہو جاتی اور کھل کر اظہارِ خیال فرماتے۔[۲]

حسن بصریؒ نے ایک سو پچاس صحابہؓ کو دیکھا تھا۔ بے شمار مسائل میں فتوے دیے، بعض علماء نے ان کے فتاویٰ سات ضخیم مجموعوں میں مرتب کیے تھے۔[۳]

حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کے ہر فتویٰ کی بنیاد کوئی حدیث ہوتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ اپنی دانست میں جس بات کو ہم سائل کے حق میں خود اس کی رائے سے بہتر سمجھتے ہیں، اُسے پیش کرتے ہیں۔[۴]

---

۱ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۵، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۳ء، طبع دوم

۲ تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۷۴-۸۲

۳ ابن قیم، اعلام الموقعین: ۱/ ۲۰

۴ اعلام الموقعین: ۱/ ۵۲

امام زہریؒ کا محدثین میں بڑا اونچا مقام ہے۔ اس کے ساتھ وہ مفتیٔ وقت اور مجتہد بھی تھے۔ محمد بن نوحؒ نے ان کے فتاویٰ کو تین جلدوں میں فقہی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا۔[۱]

ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ کے بارے میں امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ اور مجتہد تھے، اور رائے اور قیاس میں بڑی بصیرت رکھتے تھے، اسی وجہ سے ان کو 'ربیعۃ الرأی' کہا جاتا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں: ربیعہ ہماری مشکلات حل کرتے تھے، وہ صاحبِ علم اور ہم سب میں افضل تھے۔[۲]

امام مالکؒ نے فقہ میں ان سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے انتقال پر انھوں نے کہا: فقہ کی لذت ختم ہوگئی۔[۳]

حدیث و فقہ کے وسیع ذخیرہ میں تابعینؒ کے فتاویٰ اور اجتہادات بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سب کو جمع کرکے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کن مسائل میں استنباط کیا اور اس سلسلے میں ان کے سامنے کیا اصول تھے؟ ان کے فتاویٰ اور اجتہادات باقاعدہ مرتب ہوجائیں تو ان کے اجتہادی کام سے بہتر طریقہ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

تابعینؒ کے بعد امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اوزاعیؒ، لیث بن سعدؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، سفیان ثوریؒ، وکیع بن جراحؒ جیسے بہت سے ائمہ فقہ پیدا ہوئے۔ ان ائمہؒ نے بے شمار مسائل میں نہ صرف یہ کہ اپنی رائے ظاہر کی، بلکہ مسائل کے استنباط کے اُصول بھی بتائے۔ ان ہی کے دور میں ایک فن کی حیثیت سے فقہ کی ترتیب کا عمل شروع ہوا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ نے فقہ کے اصول اور استنباط و اجتہاد کے طریقے مدون کیے۔ اس کے بعد 'فقہ' کے ساتھ ساتھ 'اصولِ فقہ' نے بھی ایک مخصوص علم اور فن کی شکل اختیار کرلی۔

ان ائمہ کے اندازِ فکر میں تھوڑا بہت اختلاف رہا ہے، لیکن اتنی بات طے ہے کہ

---

۱ اعلام الموقعین: ۱/۱۹

۲ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۴۹

۳ ابن عماد حنبلی، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب: ۲/۱۵۹۔ دار ابن کثیر، بیروت ۱۹۸۸ء

یہ سب مجتہد تھے اور انھوں نے قیاس اور اجتہاد کو ایک اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اس پر عمل کرتے رہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کو جو بھی مسئلہ درپیش ہو، شریعت میں اس کا حکم صراحتاً یا دلالتاً موجود ہوگا۔ اگر بعینہٖ اس مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم ہو تو اُسے اس کی اتباع کرنی چاہیے، اگر ایسا نہ ہو تو اسے اجتہاد کے ذریعہ حق بات دریافت کرنی چاہیے۔ اسی کو اجتہاد اور قیاس کہا جاتا ہے۔[۱]

امام مزنیؒ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے دور سے لے کر ہمارے زمانے تک فقہاء تمام دینی احکام میں قیاس سے کام لیتے رہے ہیں، اس بات پر ان کا اجماع رہا ہے کہ حق کی نظیر حق اور باطل کی نظیر باطل ہے۔ اس لیے قیاس کا انکار کسی بھی شخص کے لیے صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی تشبیہ اور تمثیل ہے۔[۲]

محمد بن حسنؒ کہتے ہیں: جو شخص کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ کا عالم ہو اور فقہاءؒ کے نزدیک جو چیزیں مستحسن رہی ہیں ان کو جانتا ہو، تو اسے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کا حق ہے۔ وہ نماز، روزہ، حج اور تمام مامورات ومنہیات کے بارے میں فتویٰ دے سکتا اور اسے نافذ کرسکتا ہے، اگر اس نے غور وفکر اور اجتہاد میں اور مسئلہ سے ملتے جلتے احکام پر قیاس کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے تو اس پر عمل بھی کرسکتا ہے، چاہے وہ عملاً صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکا ہو۔[۳]

ابن جریرؒ نے یہاں تک کہا ہے کہ قیاس کا انکار بدعت ہے۔[۴]

مختلف اسباب کی بنا پر اس دور کے ائمہ میں ائمہ اربعہ کو خاص شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے ذریعہ فقہ اور اجتہاد کے اس عمل کو جو صحابہؓ کے دور سے

---

۱ امام شافعی، الرسالۃ، ص ۴۷۷، تحقیق احمد محمد شاکر، المکتبۃ العلمیۃ بیروت، لبنان

۲ اعلام الموقعین: ۱/۱۵۷

۳ اعلام الموقعین: ۱/۵۲، ۵۳

۴ علامہ انور شاہ کشمیری: فیض الباری علی صحیح البخاری، ۴/۵۰۸، مطبعۃ دار المامون، ۱۹۳۸ء، طبع اول

شروع ہوا تھا، بڑی ترقی ہوئی۔

فقہِ حنفی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس کا بیج بویا، علقمہؒ نے اس کی آب پاشی کی، ابراہیم نخعیؒ نے اس کھیتی کو کاٹا، حماد بن مسلمؒ کوفی نے اس کے دانے الگ کئے، امام ابوحنیفہؒ نے اس کا آٹا بنایا، امام ابو یوسفؒ نے اُسے خمیر کی شکل دی اور امام محمدؒ نے اس کی روٹی تیار کی، ان کے بعد سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے چلے جارہے ہیں۔[1]

یہی بات دوسری فقہوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے ائمہ نے اپنے اپنے طور پر بتدریج فقہ کو کمال تک پہنچانے کی کوشش کی۔

ان ائمہ اور ان کے تلامذہ نے اجتہاد اور مسائل کے استنباط کے جو اصول وضع کیے ان کی روشنی میں مزید استنباط کا کام صدیوں تک جاری رہا۔ ہر فقہ کے ماننے والوں میں مختلف سطح کے علماء پیدا ہوتے رہے۔

فقہاء احناف کے درجات

فقہ حنفی میں مجتہدین اور ان کی اتباع کرنے والے علماء وفقہاء کے سات طبقات بتائے گئے ہیں:

پہلا طبقہ 'مجتہدین فی الشرع' کا ہے، جنھوں نے شریعت کے احکام سے براہِ راست اجتہاد کیا۔ جیسے ائمہ اربعہ یا ان جیسے دوسرے ائمہ، جنھوں نے کتاب وسنت کو سامنے رکھا اور ان کی روشنی میں اجتہاد کے اصول وضع کیے اور ان پر عمل کیا۔

دوسرا طبقہ 'مجتہدین فی المذہب' کا ہے۔ فقہ حنفی میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے تلامذہ کا شمار اسی طبقہ میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ فروع اور جزئیات میں بسا اوقات امام صاحب سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن اصول میں وہ ان سے متفق ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ فقہِ حنفی کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ وغیرہ کو اصول سے بھی اختلاف ہے، اس لیے ان کا فقہی مسلک دوسرا سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ابن عابدین: ردالمحتار علی الدر المختار: ۱/ ۱۴۱، ۱۴۲۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۴ء

تیسرا طبقہ 'مجتہدین فی المسائل' کا ہے۔ یہ لوگ فقہ حنفی کے اصول وفروع کسی بھی چیز سے اختلاف نہیں کر سکتے، البتہ جن مسائل میں ان کے ائمہ نے صراحت نہیں کی ہے، ان کی بتائی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں ان کا حکم بیان کر سکتے ہیں۔ اس طبقہ میں خصافؒ، طحاویؒ، کرخیؒ، شمس الائمہ حلوائیؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ، علاّمہ بزدویؒ اور قاضی خانؒ جیسے اصحابِ علم داخل ہیں۔

چوتھا طبقہ 'اصحابِ تخریج' کا ہے، جو اجتہاد کی صلاحیت تو نہیں رکھتے، البتہ اپنے ائمہ کے اصول اور ان کے مآخذ سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھوں نے جو مسائل مستنبط کیے ہیں ان پر قیاس کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان کے کسی بھی مجمل یا مبہم قول کی، جس کے ایک سے زیادہ پہلو ہو سکتے ہیں، تعیین اور توضیح کر سکتے ہیں، جیسے رازیؒ اور کرخیؒ وغیرہ۔

پانچواں طبقہ 'اصحابِ ترجیح' کا ہے۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی مختلف روایات میں کسی ایک کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ ابوالحسن قدوریؒ اور صاحبِ ہدایہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

چھٹا طبقہ ان علماء کا ہے جو اپنے مذہب کی مختلف روایات میں یہ فرق کر سکتے ہیں کہ ان میں کون قوی ہے اور کون ضعیف؟ اور ظاہر روایت کیا ہے اور شاذ روایت کیا؟ جیسے 'کنز الدقائق'، 'درمختار'، 'وقایہ' وغیرہ کے مصنفین۔

ساتواں طبقہ ان مقلدین کا ہے جو اپنے مذہب کی کم زور اور مضبوط اور غلط اور صحیح روایات میں کوئی فرق نہیں کر پاتے۔[1]

یہ فقہ حنفی کی تاریخ کو سمجھانے کی ایک کوشش ہے۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور یہ بحث کی جا سکتی ہے کس امام یا فقیہ کا کیا مقام ہے اور اسے کس طبقہ میں جگہ ملنی چاہیے؟

دوسرے مذاہبِ فقہ کے اندر بھی اسی طرح کے علماء اور فقہاء پیدا ہوتے رہے ہیں، جو اپنے مذہب کے دائرے میں اجتہاد و استنباط اور تخریج و ترجیح کا کام کرتے رہے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر فقہ کی ایک تفصیلی شکل وجود میں آ گئی، اس کے اصول وقواعد زیادہ وضاحت کے ساتھ مرتب ہو گئے، اس کی انفرادیت نمایاں ہو گئی اور وہ دوسری

---

[1] ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار: ۱/ ۱۷۹-۱۸۰

فقہوں سے ممتاز ہوگئی، اس میں مسائل کو حل کرنے کی جو صلاحیت تھی، وہ کھل کر سامنے آ گئی، لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ کتاب وسنت سے ربط کم زور پڑ گیا اور ان کی جگہ فقہاء کے بتائے ہوئے اصول وفروع نے لے لی۔ کسی مسئلہ میں براہِ راست شریعت کے اصل مآخذ کی طرف رجوع کی جگہ یہ دیکھا جانے لگا کہ اس مسئلے میں فقہائے متقدمین نے کیا کہا ہے؟ کسی فقیہ اور عالم کی پہچان یہ نہیں رہی کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں مسائل کا جواب دے سکتا ہے، بلکہ فقیہ اس شخص کو سمجھا جانے لگا جو فقہی جزئیات پر وسیع نظر رکھتا ہو اور کسی بھی مسئلہ میں قدیم فقہاء کی رائے بیان کرسکتا ہو۔ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ہر فقہ کی جو تفصیلی شکل بن گئی اس نے حتمی اور آخری شکل اختیار کرلی، جسے توڑنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ اس طرح فقہ اجتہاد واستنباط کا میدان نہیں رہی، بلکہ جمود کی نذر ہوگئی۔ تقلیدِ جامد کا دور دورہ شروع ہوا اور یہ کہا جانے لگا کہ مجتہدِ مطلق کا دور تو ختم ہوچکا، البتہ اب 'مجتہدِ مقید' ہوسکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں ایسے مفکرین بھی رہے ہیں جنھوں نے مسائل کے حل کے لیے براہِ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع کی دعوت دی اور شخصی تقلید کی سخت مخالفت کی۔ ابن حزمؒ فقہِ ظاہری کے اہم ستون ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی گزرے ہوئے یا موجودہ شخص کی تقلید کرے، ہر آدمی کو اپنی طاقت کی حد تک اجتہاد کرنا چاہیے۔ اگر وہ بالکل جاہل ہے تو اسے ایسے مقام پر کسی ایسے شخص سے جو دین کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، مسئلہ معلوم کرنا چاہیے۔ جب وہ فتویٰ دے تو اس سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا اللہ اور رسول کا یہی حکم ہے؟ اگر وہ اثبات میں جواب دے تو اسے اختیار کرے اور اس کے مطابق عمل کرے، لیکن اگر اس کا جواب یہ ہو کہ یہ میری رائے یا میرا قیاس ہے، یا یہ کہ وہ کسی صحابی، تابعی یا قدیم اور جدید کسی فقہ کا حوالہ دے یا خاموشی اختیار کرلے یا سرزنش کرنے لگے تو اس کے لیے اس کے قول کو اختیار کرنا جائز نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اسے کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔[1]

---

[1] ابن حزم، المحلّٰی: ۱/ ۶۶۔ دار الآفاق الجدیدۃ بیروت، تحقیق احمد محمد شاکر۔

مزید کہتے ہیں کہ جو شخص اجتہاد میں غلطی کر جائے وہ اس شخص سے اللہ کے نزدیک بہتر ہے جو تقلید کر کے غلطی سے محفوظ رہے۔[۱]

ابنِ حزم اپنی شدت پسندی اور انفرادیت میں مشہور ہیں۔ان کی اس رائے کو بھی اسی پر محمول کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، شوکانیؒ اور بعض دوسرے اصحاب کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں، جنھوں نے کم از کم اصحابِ علم کے لیے تقلید کو جائز نہیں قرار دیا ہے۔حضرت شاہ ولی اللہؒ فقہ حنفی سے وابستہ ہونے کے باوجود تقلید جامد کو پسند نہیں کرتے تھے۔عدمِ تقلید کی ایک مستقل تحریک ہمارے درمیان رہی ہے۔ اُس کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، گو اس تحریک کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، تاہم مذاہبِ اربعہ کی طرح اُسے بھی ایک مستقل مسلک کی حیثیت حاصل ہے جو براہِ راست کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔

تقلید کے رائج اور مقبول ہونے اور اجتہاد کا دروازہ کم از کم عملاً بند ہونے کے بہت سے اسباب تھے۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علم دین کی طرف رجحان کم سے کم تر ہوتا جارہا تھا۔اگر اجتہاد کی اجازت دی جاتی تو ڈر تھا کہ یہ نازک ذمہ داری نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی اور وہ دین کو مسخ کر کے رکھ دیتے۔

اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ فقہی تفصیلات اس قدر پھیل گئیں کہ کسی ایک فقہ ہی پر پوری طرح حاوی ہونا مشکل تھا، چہ جائے کہ دوسرے مذاہب فکر پر بھی آدمی کی نظر ہوتی اور اس سے آگے بڑھ کر وہ کوئی نیا اجتہاد کرتا۔

اس کی تیسری وجہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اجتہاد کا سلسلہ جاری رہتا تو نئے مسالکِ فقہ پیدا ہوتے اور اس کے نتیجے میں فقہی اختلافات اور بڑھتے۔ ان اختلافات کو کم کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ رائج الوقت فقہی مسالک پر اکتفا کیا جائے اور مزید کسی نئے فقہی اسکول کی ہمت افزائی نہ کی جائے۔

اس فقہی جمود کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری سے

---

[۱] ابن حزم، المحلّٰی: ۱/ ۶۹

لے کر بارہویں صدی ہجری تک تمدن کے ارتقاء کی رفتار سست رہی اور ہماری فقہ کو زیادہ پیچیدہ اور نئے نئے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا، ورنہ شاید ضرورت خود اجتہاد پر مجبور کرتی اور اجتہاد کا عمل جاری رہتا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور ان سے قریب کے دور کے ائمہ نے جو کتابیں لکھیں اور ان میں جن فقہی مسائل سے بحث کی، قریب قریب وہی مباحث ہمیں فتاویٰ عالمگیری اور علامہ ابن عابدینؒ کی 'ردالمحتار علی الدرالمختار' تک لکھی جانے والی کتابوں میں ملتے ہیں، حالاں کہ ان کے درمیان کم وبیش ایک ہزار سال کا وقفہ ہے۔ بلاشبہ اس عرصہ میں کچھ نئے مسائل پیدا ہوئے، لیکن ان کی نوعیت ایسی تھی کہ ایک مسلکِ فقہ یا دوسرے مسلکِ فقہ کے تحت بہ آسانی ان کا حل تلاش کرلیا گیا۔ اسی طرح جن بزرگوں نے عدمِ تقلید کا آوازہ بلند کیا، ان کے موضوعات اور مباحث بھی اس عرصہ میں وہی رہے جو دیگر مکاتبِ فقہ کے تھے۔

پچھلے دو ڈھائی سو سال میں حالات کافی تبدیل ہوگئے۔ سائنس کی ترقی نے بہت سے سوالات پیدا کردیے۔ آمد و رفت کی وہ سہولتیں میسر آگئیں جو پہلے نہیں تھیں، نشر واشاعت اور رسل و رسائل کے طریقے بدل گئے، کاروبار اور لین دین کے نئے طریقے وجود میں آگئے، صنعتی ترقی، بڑھتی ہوئی آبادی اور پیچیدہ شہری زندگی نے پرانے آداب و اطوار میں تبدیلی پیدا کردی اور ایک نیا معاشرتی ڈھانچہ وجود میں آگیا۔ ان معاملات میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خدا کا دین ہمیں کیا ہدایت دیتا ہے اور ہمارے مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے؟ جو لوگ دین کے علم بردار ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مسائل کا حل تلاش کریں۔ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو اور اس بات کا اندیشہ پیدا ہوجائے کہ اجتہاد کے ذریعے صحیح راہ نہ دکھائے جانے پر لوگ شریعت سے ہٹ جائیں گے، تو مجتہدین پر اجتہاد واجب ہے۔ اگر وہ اس مسئلے کو حل نہ بھی کرسکیں تو کوشش اور جدوجہد کرنا ان کے لیے ضروری ہے۔[1]

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ قیاس یا اجتہاد، احکامِ شریعت کو جاننے کا

---

[1] عبدالعزیز البخاری، کشف الاسرار لاصول البزدوی: ۳/۱۱۳۴، طبع مکتب الصنائع، ۱۳۰۷ھ، نیز ملاحظہ ہو ابن امیر الحاج، التقریر والتحبیر: ۲/۲۹۲

نہ تو واحد ذریعہ ہے اور نہ ہر مسئلہ میں اس کی ضرورت ہے۔ خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو دیکھا جائے گا۔ اسی کے تحت اجماعِ امت بھی داخل ہے۔ ان ذرائع سے جو حکم صراحت کے ساتھ معلوم ہوجائے، اس کے بارے میں ایک مومن کا رویہ اختلاف یا اجتہاد کا نہیں، بلکہ بے چوں و چرا اطاعت کا ہوگا۔ قرآن مجید نے صاف الفاظ میں کہا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○
(الاحزاب:۶۳)

کسی بھی مومن مرد یا عورت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ جس چیز کا فیصلہ کردیں انھیں اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی رہے، جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گم رہی میں پڑ گیا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ارشادِ باری ہے کہ کسی معاملے میں اختلاف ہو تو اس کے حل کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (النساء:۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے 'اولو الامر' (حاکم) ہیں۔ پھر اگر کسی معاملے میں تمھارے درمیان نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

جس معاملے میں کتاب وسنت میں صراحت نہ ہو، اس میں خدا اور رسولؐ کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ کوشش آخری حد تک اور پورے اخلاص کے ساتھ ہوگی۔ اسی کے لیے 'قیاس' اور 'اجتہاد' کی ضرورت پڑتی ہے۔ مشہور حدیث ہے، حضرت

معاذ بن جبلؓ کو رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا تو ان سے پوچھا: جب تمھارے سامنے کوئی مقدمہ آئے تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے دریافت کیا: اگر اللہ کی کتاب میں اس کا حل نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے پھر سوال کیا: اگر سنتِ رسولؐ میں بھی اس کا حل نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: 'اجتھد رأئی ولاَ الو' مطلب یہ کہ کتاب وسنت کی روشنی میں قیاس کرنے اور رائے قائم کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے خوش ہوکر حضرت معاذؓ کے سینے پر دست مبارک رکھا اور فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے رسولؐ کے قاصد کو ایسے رویہ کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہے۔[۱]

خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے آتا تو وہ پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے۔ اگر قرآن میں اس کا جواب پاتے تو اُس پر عمل کرتے۔ اگر وہاں اس کا جواب نہ پاتے تو دیکھتے کہ رسولِ خدا ﷺ کی سنت کیا کہتی ہے؟ اگر سنت میں اس کا حل مل جاتا تو اُسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ رائے اور اجتہاد سے اسی وقت کام لیتے جب کہ ان دونوں مآخذ میں صراحت موجود نہ ہوتی۔[۲]

---

۱ ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، باب اجتہاد الرای فی القضاء۔ ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی۔ اس کی سند پر تنقید کی گئی ہے امام ترمذی فرماتے ہیں 'لیس اسنادہ عندی بمتصل، میرے نزدیک اس کی سند متصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی حارث بن عمرو نے یہ حدیث حضرت معاذؓ کے بعض اصحاب (تلامذہ) سے روایت کی ہے، لیکن متعین طور پر نہیں بتایا ہے کہ وہ کون ہیں؟ ابن حزم نے بھی اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ کہتے ہیں: حارث بن عمرو خود بھی مجہول ہے۔ المحلّٰی: ۱/۶۲۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ کسی ایک فرد سے روایت کی جگہ 'اصحاب معاذ' کہنا زیادہ بلیغ ہے، اس لیے کہ حضرت معاذؓ کے اصحاب معروف اور مشہور ہیں۔ ان میں سے کسی میں کوئی ضعف نہیں ہے۔ ویسے بعض محدثین نے یہ حدیث سند متصل سے بھی روایت کی ہے۔ اسی وجہ سے اہل علم نے اسے نقل کیا ہے اور اجتہاد کے حق میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین: ۱/۱۵۴-۱۵۵۔

۲ اعلام الموقعین: ۱/۴۹

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ گورنر عراق کو مختلف مواقع پر خطوط لکھے تھے۔ ان میں ایک بڑا اہم خط قضا اور فیصلہ سے متعلق ہے۔ اسے ابو عبید نے کتاب الاموال میں نقل کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں: **الفهم الفهم فی ما ادلی الیک بما ورد علیک مما لیس فی قرآن ولا سنة، ثم قایس الأمور عند ذلک و اعرف الامثال،ثم اعمد فی ماتریٰ الی احبها الی الله و اشبها الی الحق،** یعنی جو چیز کتاب و سنت میں نہ ہو، اس پر خوب غور کرو۔ چیزوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرو، مثالوں کو سمجھو، پھر اللہ اور رسولؐ کے نزدیک جو چیز پسندیدہ اور حق سے مشابہت رکھے اُسے اختیار کرو۔[۱]

ائمہ کرام میں سے ہر ایک نے صراحت کی ہے کہ جب کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں مل جائے تو رائے اور قیاس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ فقہ حنفی، قیاس اور اجتہاد میں ممتاز ہے، اس نے اس میدان میں بے نظیر خدمت انجام دی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے صراحت کے ساتھ اور بار بار کہا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں جب کوئی حکم مل جاتا ہے تو ہم فتویٰ اسی کے مطابق دیتے ہیں، اجتہاد تو اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان میں صراحت نہ ہو۔[۲]

یہی بات اصولِ فقہ میں اس طرح کہی گئی ہے: احکامِ شریعت جاننے کے لیے قیاس مستقل بالذات دلیل نہیں ہے، اسے کتاب و سنت اور اجماع سے مستنبط ہونا چاہیے۔ قیاس ایک ضمنی چیز ہے۔ اس سے یقین نہیں حاصل ہوتا۔ اس کے برعکس اور دلائل شریعت سے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کتاب، سنت اور اجماع سے قیاس ٹکرائے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ کسی مسئلے میں قیاس پر عمل اسی وقت ہوگا، جب کہ یہ تینوں ذرائع خاموش ہوں۔[۳]

---

[۱] امام ابن قیم نے اس خط کے مضامین پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اسی ذیل میں قیاس کی مشروعیت، قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت اور اس سے متعلق مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین: ۱/ ۶۷-۱۵۴

[۲] ابوالمؤید الموفق بن احمد المالکی، مناقب الامام اعظم ابی حنیفہؒ: ۱/ ۷۸، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، ۱۳۲۱ھ

[۳] عبدالعلی محمد بن نظام الدین الانصاری، فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، المطبعۃ الامیریۃ بولاق مصر ۱۳۲۴ھ، ۲/ ۳

اجتہاد بڑا نازک کام ہے۔ اس کے لیے ایک طرف ان مسائل کو پوری طرح سمجھنا ہوگا جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے۔ دوسری طرف کتاب وسنت کے وسیع علم اور قیاس اور اجتہاد کے اصول وآداب سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ آدمی عربی زبان وادب میں مہارت رکھے اور نہ یہ بات کافی ہے کہ وہ دین کی عام معلومات رکھتا ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان نصوص اور ان کے الفاظ ومعانی پر گہری نظر رکھتا ہو، جن پر اس کے قیاس اور اجتہاد کی بنیاد ہے۔ ساتھ ہی دین کی روح اور اس کے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھے۔

کتاب وسنت کے بعد اس سلسلے میں اس زبردست فقہی ذخیرے سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا جو ہمارے پاس موجود ہے اور جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسانی فکر کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں خامیاں بھی ہوسکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ذخیرہ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے وجود میں آیا ہے اور تحقیق وتنقید کے مختلف مراحل سے گزر کر اس نے ایک خاص شکل اختیار کی ہے۔ اس پر جن لوگوں نے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں، ان کے علم وفہم، فقہ وبصیرت، تقویٰ اور اخلاص پر امت کو اعتماد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس امت کے بہت بڑے حصے نے اسے قبول کیا، افراد نے بھی اس پر عمل کیا اور حکومتوں اور معاشروں نے بھی اسے اپنا دستور بنایا۔ اس پورے ذخیرے سے بغیر کسی تعصب کے فائدہ اٹھانا چاہیے اور کسی ایک مسلکِ فکر سے وابستگی دوسرے مسالکِ فکر سے استفادہ میں مانع نہیں ہونی چاہیے۔

اس فقہی ذخیرہ کو نظر انداز کرکے اجتہاد کا کام نہیں ہوسکتا۔ اسی سے اجتہاد کے اصول، طریقے اور نمونے سامنے آئیں گے۔ جن مسائل میں اجتہاد کی ضرورت ہوگی ان میں نظیریں ملیں گی اور اس کے مسلسل مطالعہ اور تحقیق سے اجتہاد کی صلاحیت اُبھرے گی۔

خود صحابۂ کرامؓ اور تابعین اپنے پیش رو ائمہ کے فیصلوں سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے فیصلے تلاش کرتے تھے[1] حضرت عمرؓ کے بعد حضرت

---

[1] اعلام الموقعین: ۱/۴۹، ۵۰

ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلے نمونے کا کام دیتے رہے۔ اسی طرح اکابر صحابہؓ کے فتووں کو تابعینؒ نے اپنے لیے نمونہ بنایا۔ اس طرح اجتہاد کا سلسلہ آگے بڑھا۔

ائمہ امت اور سلف صالحین نے بڑی صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے اہل علم کی رایوں اور مسائل میں ان کے اختلاف سے واقف ہونا ضروری ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے اس طرح کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں:

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: سلف کے اختلافات سے جو شخص واقف نہیں ہے اسے فقہ کی بو باس تک نصیب نہیں ہوئی۔ ہشام بن عبید اللہ الرازی کا قول ہے کہ جس شخص کو اختلاف قرأت کا علم نہ ہو وہ قاری نہیں اور جو فقہا کے اختلافات کو (دلائل کے ساتھ) نہ جانے وہ فقیہ نہیں ہے۔

حضرت عطاء بن رباح کہتے ہیں: کسی ایسے شخص کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جو اہل علم کے اختلافات سے واقف نہ ہو، ورنہ اس کا امکان ہے کہ زیادہ قوی رائے کو چھوڑ کر وہ اپنی کم زور رائے پر قائم رہے۔

ایوب سختیانی اور ابن عیینہ کہتے ہیں: جو شخص اہل علم کے اختلافات کو بہت کم جانتا ہے وہی فتویٰ دینے میں بے باکی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایوب سختیانی مزید کہتے ہیں کہ فقہاء کے اختلافات سے واقف شخص فتویٰ دینے میں زیادہ محتاط ہوتا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں: فتویٰ دینے کا جواز اسی کو حاصل ہے جس کے علم میں صحابۂ کرام کے اختلافات اور ناسخ و منسوخ کی تفصیل ہو۔

یحییٰ بن سلام کہتے ہیں: جس شخص کو سلف کے اختلافات سے واقفیت حاصل نہیں ہے اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ جسے ان کے مختلف اقوال کا علم نہیں ہے اس کے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ امر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

سعید بن ابوعروبہ کہتے ہیں: جو اختلاف رائے کو نہ سن سکے اسے عالم نہ سمجھو۔

قبیصہ بن عقبہ کا قول ہے: جو اہل علم کے اختلافات کو نہ جانے وہ (فقہ کے میدان میں) کامیاب نہیں ہوسکتا۔

علامہ شاطبی کہتے ہیں: اس سلسلہ کے اور بھی اقوال ہیں۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف فقہی آراء کو حفظ کرلیا جائے، بلکہ ان کے مواقع اختلاف (موقع ومحل) سے واقفیت ہو اور یہ اسی وقت ہوگا جب غور وفکر سے کام لیا جائے (اور صحیح رائے جاننے کی کوشش کی جائے)۔[۱]

علامہ شاطبی نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ کسی مسئلہ میں بہت سی رائیں ہوسکتی ہیں۔ صحابۂ کرام کے درمیان بھی رایوں کا اختلاف رہا ہے۔ یہ سب رائیں بہ یک وقت صحیح نہیں قرار دی جاسکتیں۔ مفتی اور مجتہد کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو رائے دلیل کے لحاظ سے قوی ہو اسے ترجیح دے اور اس پر عمل کرے۔[۲]

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی شخص کا اجتہاد کتاب وسنت کے قائم مقام نہیں ہے، اس لیے وہ حرفِ آخر بھی نہیں ہے۔ کسی اجتہاد کو آخری حیثیت دے دی جائے تو اجتہاد کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا رویہ ہمارے لیے بہترین مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب کوئی حکم اللہ کی کتاب میں مل جائے، یا ثقہ راویوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہو تو پھر میں کسی طرف نہیں دیکھتا۔ اگر کسی مسئلے میں صحابہؓ کے اقوال مختلف ہوں تو اُن میں ترجیح دیتا ہوں، اُن سے باہر نہیں جاتا، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور سعید بن مسیّبؒ وغیرہ تک پہنچ جاتا ہے تو سمجھتا ہوں کہ جس طرح انھوں نے اجتہاد کیا، اسی طرح مجھے بھی اجتہاد کا حق ہے۔[۳]

انفرادی فتویٰ اور اجتہاد کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے۔ اس ضرورت کو دور اول

---

۱ ابواسحاق الشاطبی، الموافقات فی اصول الشریعۃ، تحقیق عبداللہ دراز، المجلد الثانی الجزء الرابع ص ۱۱۷۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان۔

۲ علامہ شاطبی کے الفاظ ہیں: الشریعة کلها ترجع الی قول واحد فی فروعها و ان کثر الخلاف... اس طویل اور قیمتی بحث کے لیے ملاحظہ ہو الموافقات، ج/۴ ص ۸۵-۱۱۹

۳ الموفق، المناقب: ۱/ ۸۹

کے ائمہ وفقہاء بذریعہ اتم پوری کرتے رہے ہیں۔ بعد کے ادوار میں ان ہی کی روشنی میں علماء نے احکام دین کی وضاحت کی اور فتوے جاری کیے۔ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان میں کہیں کہیں اجتہادی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن بعض مسائل اجتماعی غور وفکر اور فیصلہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں معیشت، معاشرت، تمدنی تقاضے، سیاست، قانون، طب وصحت کے مسائل اور ماحولیات جیسے مختلف میدانوں میں اتنے مسائل درپیش ہیں کہ قدیم فقہی ذخیرہ میں ان کا براہِ راست جواب نہیں مل سکتا۔ یہ مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کرنا کسی ایک فرد کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کے ماہرین اور جدید مسائل پر نظر رکھنے والے افراد جمع ہوں اور غور وفکر کے ذریعہ کسی نتیجہ تک پہنچیں۔ یہ ایک طرح سے خلفاء راشدین کا اسوہ ہے۔ جن مسائل میں حکم شریعت واضح نہیں ہوتا ان میں وہ ان اصحاب سے مشورہ کرتے جو علم وآگہی اور تفقہ میں معروف تھے اور ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے۔ اس پہلو سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عمل بہت نمایاں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی بڑی حد تک یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ حسب ضرورت اپنے تلامذہ سے مشورہ کرتے اور باہم تبادلۂ خیال کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتے۔ موجودہ دور میں اس مقصد کے لیے سمینار اور مجالسِ مذاکرہ منعقد کیے جاتے ہیں۔ فقہی مسائل پر غور وفکر کے لیے اسلامی ممالک میں متعدد اکیڈیمیاں قائم ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کئی سال سے اسلامی فقہ اکیڈیمی سرگرم عمل ہے۔ بحث وتمحیص کے ذریعہ اس کے جو فیصلے سامنے آتے ہیں ان کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں
سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:
جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور
Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916
Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم:۴، رول:۹

۱۔مقام اشاعت: پان والی کوٹھی،دودھ پور،علی گڑھ
۲۔نوعیت اشاعت: سہ ماہی
۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری
۴۔قومیت: ہندوستانی
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۵۔ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
۶۔ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،
پان والی کوٹھی، دودھ پور،علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵
۲- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)
سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ
۳۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)
شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۴۔ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵
۵۔مولانا محمد فاروق خاں (رکن)
۱۳۵۳- بازار چتلی قبر، دہلی-۶
۶۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (رکن)
فریدی ہاؤس، سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)
۷۔مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، ۲۵
۸۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)
مالاتھن کنڈی ہاؤس، یلیری، کالی کٹ
۹۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)
طارق منزل، بریا توہاؤسنگ کالونی، رانچی
۱۰۔ جناب محمد جعفر (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵
۱۱۔انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)
حیدرآباد

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

امام ابوحنیفہؒ اور اصولِ فقہ

——————— ڈاکٹر حافظ عبداللہ

اب اس بات میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ صحابہ و تابعین اور پھر ائمہ مجتہدین کے پیش نظر نصوص سے استنباط اور نئے مسائل کا حل تلاش کرنے کے دوران با قاعدہ قواعد و ضوابط ہوتے تھے جن کو وہ پیش نظر رکھتے تھے۔ لہٰذا فقہ کے اصول وقواعد کی موجودگی اور دوران استنباط واستخراج ان کا استعمال یقینی اور قطعی ہے۔ البتہ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اصول فقہ کے موضوع پر سب سے پہلے باقاعدہ کس نے کتاب تالیف کی؟ اگرچہ اس بات کا قطعی اور یقینی طور پر تعین کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ کسی علم میں اولین تالیف کا شرف کس کو حاصل ہوا جبکہ علوم کی تدوین وترتیب اور تصنیف وتالیف اپنے ابتدائی مراحل میں ہو اور اس پر مستزاد یہ کہ ابتدائی تالیفات و تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ بھی نہ رہا ہو۔ دور حاضر کے ایک معروف محقق ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان نے بجا فرمایا ہے:

> ''قوموں میں علوم کا ظہور اچانک نہیں ہوتا، بلکہ وہ غور وخوض اور گہری فکر کے ایک زمانہ سے گزرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے معانی روشن ہوجاتے ہیں، ذہنوں میں ان کی حدود واضح ہوجاتی ہیں اور ان کی تدوین کے اسباب مہیا ہوجاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی نمو اور نکھار میں قانون تطور و وتدریج سے گزرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (کسی علم کی) ابتدا اور اس (علم کی) زمام تھامنے والے اولین افراد کا تعین مشکل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ علمِ اصول فقہ میں پہلی تالیف (کے تعین) کے بارے میں بھی ہے۔ مختلف اہل مذاہب کے مابین (اصول فقہ میں) پہلی تالیف کے

بارے میں اختلاف ہے، باوجود یہ کہ بعض (اہل مذہب) کا دعویٰ اس مسئلہ پر اجماع کا ہے۔'' [۱]

دورِ تدوین میں فقہی مکاتبِ فکر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مختلف بلادِ اسلامیہ میں متعدد ائمہ مجتہدین، اجتہاد و استنباط کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کررہے تھے۔ علامہ ابنِ حزمؒ فرماتے ہیں:

"ثم أتى بعد التابعين فقهاء الامصار: كأبى حنيفة، و سفيان، و ابن أبى ليلى بالكوفة، و ابن جريج بمكة، ومالک و ابن الماجشون بالمدينة، و عثمان البتى و سوار بالبصرة، و الأوزاعى بالشام، و الليث بمصر، فجروا على تلک الطريقة من أخذ كل واحد منهم عن التابعين من أهل بلده فيما كان عندهم، و اجتهادهم فيما لم يجدوا عندهم، و هو موجود عندغيرهم، و لا يكلف الله نفسا الا وسعها" [۲]

پھر تابعین کے بعد مختلف علاقوں میں فقہاء ہوئے، جیسا کہ ابوحنیفہ، سفیان، ابن ابی لیلیٰ کوفہ میں، ابن جریج مکہ میں، مالک اور ابن ماجشون مدینہ میں اور عثمان البتی اور سوار بصرہ میں، اوزاعی شام میں، لیث مصر میں۔ پس ان (فقہاء) نے اپنے اپنے شہر میں موجود تابعین سے جو کچھ ان کے پاس تھا، اسے اخذ کیا اور جو کچھ ان کے پاس نہیں تھا اس کے بارے میں اجتہاد کیا، اگرچہ (یہ اجتہادات) دوسرے (شہر کے) لوگوں کے پاس موجود تھے۔ اللہ نے ہر شخص کو اسی کا مکلّف کیا ہے جو اس کے بس میں ہے۔

ان میں دو مکاتبِ فکر ایسے ہیں جن کا منہج زیادہ مقبول ہوا۔ ایک حجاز کا مکتبۂ فکر جس کی امامت امام مالکؒ فرمارہے تھے اور اس کی بنیاد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عباسؓ کے فتاویٰ اور احکام پر قائم ہوئی اور دوسرا عراقی مکتبہ فکر تھا جس کی امامت امام ابوحنیفہؒ فرما رہے تھے اور اس کی بنیاد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت علیؓ، قاضی شریحؒ اور پھر ان کے تلامذۃ علقمہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور حمادؒ کے فتاویٰ اور احکام پر قائم تھی۔

لیکن ان دونوں مکاتب فکر میں سے عراقی مکتبۂ فکر کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کے قائد امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تدوین کے لیے باقاعدہ مجلس تشکیل دی جس کے لیے آپ نے اپنے تلامذہ میں سے چالیس ایسے افراد کا انتخاب فرمایا جو خاص خاص فنون میں، جو تدوین وتکمیل فقہ کے لیے ضروری تھے، استادِ زمانہ تسلیم کیے جاتے تھے، مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف وغیرہ حدیث وآثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر قوت استنباط میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔

علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں:

وكان أجلى مميزات مذهب أبى حنيفه، أنه مذهب شورى، تلقته جماعة عن جماعة اِلى الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين بخلاف سائر المذاهب، فانها مجموعة آراء لأئمتها. [۳]

''مسلک امام ابو حنیفہ کے اہم امتیازات میں سے یہ ہے کہ یہ مسلک شورائی ہے، اسے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے حاصل کیا اور یہ سلسلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک ہے، اس کے برعکس دیگر مسالک ان کے ائمہ کی آراء کا مجموعہ ہیں۔

علامہ کوثری آگے فرماتے ہیں:

مغیرہ بن حمزہ کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ کے اصحاب جنہوں نے ان کے ساتھ کتب کی تدوین کی، چالیس افراد تھے جو کہ (علم ومرتبہ میں) بڑوں کے (بھی) بڑے تھے۔

اسد بن الفرات نے فرمایا: ''امام ابوحنیفہ کے اصحاب جنہوں نے ان کے ساتھ کتب کی تدوین کی، چالیس افراد تھے۔ ان میں سے ابتدائی دس افراد میں یہ حضرات شامل تھے۔ زفر بن ہذیلؒ، داؤد طائیؒ، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السلمی (امام شافعیؒ کے مشائخ میں سے ایک) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ (جو ان کے لیے تیس سال تک کتابت کرتے رہے)۔ مجھے اسد بن عمرو نے بتایا کہ وہ حضرات کسی سوال کے جواب میں ابوحنیفہؒ کی موجودگی میں مختلف آراء دیا کرتے

تھے ۔ ایک کا جواب کچھ ہوتا تو دوسرے کا جواب کچھ اور۔ پھر وہ مسئلہ کو امام ابوحنیفہ کے سامنے پیش کرتے اور ان سے پوچھتے۔ پس وہ ایسا جواب دیتے جو کہ جامع ہوتا یعنی اقرب (الی الصواب)۔ اور کسی مسئلہ کے حل کے لیے تین دن تک بحث وگفتگو ہوتی رہتی، پھر وہ اسے دیوان میں لکھ دیتے۔''[۳] الف

فقہ حنفی کے طریقۂ تدوین سے متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا، اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کرلیا جاتا اور نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں، کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحب بہت غور اور تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلے کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی آراء پر قائم رہتے، اس وقت وہ سب مختلف اقوال قلم بند کرلیے جاتے، اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔''[۴]

علامہ کوثری تحریر فرماتے ہیں:

"قال اسحاق بن ابراهيم: كان أصحاب أبي حنيفه يخوضون معه في المسألة، فإذا لم يحضر عافية بن يزيد القاضي قال أبو حنيفة: لا ترفعوا المسألة حتى يحضر عافية، فاذا حضر عافية و وافقهم قال ابو حنيفة: أثبتوها، و ان لم يو افقهم، قال أبو حنيفة: لا تثبتوها.

اسحاق بن ابراہیم کا قول ہے: امام ابوحنیفہ کے اصحاب ان کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور و خوض کرتے تھے۔ پس اگر عافیہ بن یزید القاضی موجود نہ ہوتے تو امام ابوحنیفہ فرماتے: اس مسئلہ کو اس وقت تک نہ اٹھایا جائے جب تک عافیہ موجود نہ ہوں۔ جب عافیہ موجود ہوتے اور ان کی موافقت کرتے تو امام ابو حنیفہ فرماتے اس (مسئلہ کو) ضبط تحریر میں لے آؤ اور اگر وہ موافقت نہ کرتے تو امام ابوحنیفہ فرماتے اسے مت تحریر کرو۔

یقول زفر: کنا نختلف اِلی أبی حنیفة و معنا أبو یوسف و محمد بن الحسن، فکنا نکتب عنه، قال زفر، فقال یوما ابو حنیفة لأبی یوسف: و یحک یا یعقوب، لا تکتب کل ما تسمع منی، فاِنی قد أری الرای الیوم و أترکه غدا، و أری الرأی غدا، وأترکه فی غده، انظر کیف کان ینهی أصحابه عن تدوین المسائل، اِذا تعجل احدهم بکتابتها قبل تمحیصها کما یجب.''[۵]

زفرؒ فرماتے ہیں: ''ہم ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بن حسن ہوتے۔ ہم ان کے اقوال لکھتے تھے۔ ایک دن امام ابوحنیفہ نے امام ابو یوسف سے فرمایا۔ ''اے یعقوب، تمھارا بھلا ہو۔ جو کچھ مجھ سے سنتے ہو اسے نہ لکھ لیا کرو۔ میں آج ایک رائے قائم کرتا ہوں، کل اسے چھوڑ دوں گا۔ کل ایک رائے رکھوں گا، پرسوں اسے چھوڑ دوں گا''۔ دیکھئے کہ امام ابو حنیفہ اپنے ساتھیوں کو، جب وہ بحث وتمحیص کے بغیر مسائل لکھنے میں جلدی کرتے تو انھیں تدوینِ مسائل سے کیسے منع کرتے تھے۔

علامہ کوثری الموفق المکی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''انه وضع أبو حنیفة مذهبه شوری بینهم لم یستبد فیه بنفسه دونهم اجتهادا منه فی الدین و مبالغه فی النصیحة لله و رسوله و المؤمنین، فکان یلقی المسائل مسألة مسألة و یسمع ما عندهم و یقول ماعنده و یناظر هم شهرا أو اکثر حتی یستقر أحد الأقوال فیها، ثم یثبتها أبویوسف فی الأصول حتی اثبت الأصول کلها، و هذا یکون أولی

امام ابوحنیفہؒ نے اپنا مسلک باہمی مشاورت کی بنیاد پر وضع کیا۔ انہوں نے خود کو برتر نہیں سمجھا اور اپنی رائے کو دوسروں پر مسلّط نہیں کیا۔ دین کے معاملے میں ان کی طرف سے اس کی پوری کوشش ہوئی۔ ایسا انھوں نے اللہ، اس کے رسول اور مومنین سے خیر خواہی کے جذبے سے کیا۔ وہ ایک ایک مسئلہ پیش کرتے تھے اور (اپنے اصحاب سے) جو ان کے پاس ہوتے ان کے خیالات سنتے اور اپنی بات سناتے۔ اس طرح باہم ایک ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ مباحثہ چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ

و أصوب، و إلى الحق أقرب، والقلوب اليه أسكن وبه أطيب، من مذهب من انفرد فوضع مذهبه بنفسه، و يرجع فيه إلى رأيه.“[۶]

کسی ایک قول پر استقرار ہوجاتا، پھر امام ابو یوسف اسے کتاب الأصول میں تحریر کرتے۔ یہاں تک تمام اصول کا انضباط عمل میں آگیا۔ اس لیے مسلک امام ابوحنیفہ اولیٰ، قرین صواب، حق کے زیادہ قریب، قلوب کے لیے باعث اطمینان اور پاکیزہ ترین ہے، اس مسلک کے مقابلہ میں جس کو (اس کے بانی نے) انفرادی طور پر وضع کیا اور اس (مسلک) کا مرجع اس کے (بانی) کی رائے ہے۔“

اسی طرح ایک مسئلہ کی متعدد صورتیں زیر بحث لائی جاتیں اور خوب بحث وتمحیص کے بعد اسے تحریر کیا جاتا۔ علامہ کوثری فرماتے ہیں:

”اور ابوحنیفہؒ کا اپنے ساتھیوں کو فقہ سکھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مسائل پر متعلق گفتگو کرتے ہوئے کسی مسئلہ پر ایک رائے پیش کرتے اور اس کی تائید میں ان کے پاس جو دلائل و براہین ہوتے انھیں پیش کرتے۔ پھر اپنے ساتھیوں سے پوچھتے کہ کیا ان کے پاس اس (رائے) کے معارضہ میں کچھ (دلائل) ہیں۔ پس جب انھیں اپنی رائے کو تسلیم کرتا ہوا پاتے تو خود ہی جو کچھ انہوں نے پہلے کہا اس پر رد کرنا شروع کرتے، یہاں تک سامعین ان کی دوسری رائے کے درست ہونے کے قائل ہوجاتے تو ان سے اپنی اس نئی رائے کے بارے میں ان کی رائے طلب کرتے۔ پھر جب دیکھتے کہ ان کے پاس کوئی بات نہیں تو تیسری رائے سامنے لاتے۔ پھر سب کا رجحان اس تیسری رائے کی طرف ہوجاتا۔ آخر میں ان میں سے ایک رائے کو جو کہ صائب ہوتی، واضح دلائل سے محکم کرتے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا امتیازی طریقۂ تفقہ ہے۔“[۷]

اس مجلسِ تدوین فقہ نے، جس میں محدثین، فقہاء، لغت وعربیت کے ائمہ اور

استنباط واجتہاد کے ماہرین شریک تھے جو مسئلہ تحریر کرنے سے پہلے خوب غور وفکر، بحث و نظر اور نقد و جرح کرتے تھے، عرصہ تیس سال میں اپنا کام مکمل کیا۔ اس مجلس کی مذکورہ ہیئت اور طریقہ کار اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں نہ صرف فروع اور جزئیاتِ فقہ کو زیر بحث لایا جاتا ہوگا، بلکہ استنباط کے اصول وقواعد کی روشنی میں ان پر بحث ہوتی ہوگی اور خود استنباط کے اصول وقواعد کی بھی تنقیح وترتیب کا کام ہوتا ہوگا۔ اس کے ساتھ اگر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ عراق کا یہ مکتب فکر قیاس اور رائے کو استعمال کرنے کے لحاظ سے مشہور بھی تھا تو کچھ تعجب نہیں کہ خود اس مکتب فکر کے امام حضرت ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس اور استنباط کے اصول وقواعد سے متعلق کتاب تصنیف فرمائی ہو یا املا کروائی ہو۔ جیسا کہ علامہ کوثریؒ تحریر فرماتے ہیں:

"ومما یذکر فی مؤلفات الاقدمین من کتب ابی حنیفة کتاب الرأی ذکرہ ابن ابی العوام." [۸]

''قدماء کی تالیفات کے ضمن میں امام ابو حنیفہ کی کتابوں میں سے کتاب الرأی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسے ابن ابی العوام نے ذکر کیا ہے۔''

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جمع و تدوین کے اولین دور کے سب سے بڑے مصنف امام ابوحنیفہ تھے۔ ان کا کوئی معاصر اس میں ان کا ہم سر نہیں۔

ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں:

"لم یظهر لاحد من ائمة الاسلام المشهورین مثل ماظهر لابی حنیفة من الاصحاب والتلامیذ و لم ینتفع العلماء و جمیع الناس بمثل ما انتفعوا به و باصحابه فی تفسیر الاحادیث المشتبهة و المسائل المستنبطة و النوازل و القضاء والاحکام، جزاهم الله خیرا، و قد

''امام ابوحنیفہ کے جتنے اصحاب و تلامذہ مشہور ہوئے، اتنے ائمہ اسلام میں سے کسی کے بھی نہیں ہوئے۔ اسی طرح علماء اور دیگر حضرات احادیث مشتبہ، مسائل مستنطبہ، نوازل، قضاء، اور احکام کے سلسلے میں جتنا فائدہ ان سے اور ان کے اصحاب سے اٹھایا اتنا کسی اور سے نہیں اٹھایا۔ اللہ انہیں بہترین جزا عطا کرے۔ بعض

ذکر منهم بعض متأخری المحدثین فی ترجمته نحو الثمانمائة مع ضبط أسمائهم و نسبهم بما یطول ذکره.''[9]

متأخرین محدثین نے امام ابوحنیفہ کی سوانح میں نام ونسب کے ساتھ ان کے آٹھ سو اصحاب اور تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے، اس کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔''

علامہ کوثری نے مذہب حنفی کے پھیلاؤ کی اصلی وجہ اس اجماعی طریقۂ تدوین کو قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ اپنے اصحاب سے اپنی رائے کے قبول پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انھیں آمادہ کرتے تھے کہ اپنی آراء پیش کریں۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہوجاتا، پس وہ بات قبول کر لیتے جو دلیل سے واضح ہوجاتی تھی اور اسے چھوڑ دیتے جو دلیل سے رد ہوجاتی۔ وہ فرماتے تھے: ''کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ ہماری رائے کے مطابق رائے اختیار کرے جب تک یہ نہ جان لے کہ ہم نے یہ قول کیسے اختیار کیا۔''[10]

اس دور میں نہ صرف امام ابوحنیفہؒ کی کتب متداول ومروج ہوئیں، بلکہ بڑے بڑے ائمہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔

امام مالکؒ نے خالد بن مخلد قطوانی کو خط لکھ کر امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں طلب کیں اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔[11]

عبدالعزیز الدراوردی سے روایت ہے:

أن مالکا کان ینظر فی کتب أبی حنیفه و ینتفع بها.[12]

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ کی کتب دیکھا کرتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''من لم ینظر فی کتب ابی حنیفة لم یتبحر فی الفقه.''[13]

جس نے امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں نہیں دیکھیں، اس نے فقہ میں عبور حاصل نہیں کیا۔

زائدہ بن قدامہ نے ایک مرتبہ سفیان ثوریؒ کے سرہانے ایک کتاب پائی جس کو وہ دیکھا کرتے تھے، انہوں نے ان سے اس کو دیکھنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت دے دی، اس کے بعد زائدہ بن قدامہ کہتے ہیں:

"فاذا کتاب الرھن لابی حنیفة ، فقلت له تنظر فی کتبه ؟ فقال: وددت انها کلها عندی مجتمعة انظر فیها، فما بقی فی شرح العلم غایة، و لکن ماننصفه." ۱۴

وہ امام ابوحنیفہؒ کی کتاب الرھن تھی ، میں نے کہا: کیا آپ ان کی کتابیں دیکھتے ہیں؟ فرمایا" میں تو چاہتا ہوں کہ ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوں اور میں ان کو دیکھتا رہوں۔ انہوں نے علم کی شرح میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر ہم ان سے انصاف کا معاملہ نہیں کرتے۔

عبداللہ بن داؤد واسطی کا قول ہے:

"من اراد ان یخرج من ذل العمی و الجهل و یجد لذة الفقه فلینظر فی کتب ابی حنیفة." ۱۵

"جو چاہتا ہے کہ اندھے پن اور جہالت کی ذلت سے نکلے اور فقہ کی لذت پائے تو وہ امام ابوحنیفہؒ کی کتب کا مطالعہ کرے۔"

خطیب بغدادیؒ سجادۃ راوی کا بیان نقل فرماتے ہیں:

"دخلت أنا و ابو مسلم المستملی علی یزید بن هارون- وهو نازل ببغداد علی منصور بن المهدی- فصعدنا الی غرفة هو فیها فقال له أبو مسلم : ماتقول یا أبا خالد فی أبی حنیفة و النظر فی کتبه ؟ قال: انظروا فیها ان کنتم تریدون أن تفقهوا فانی ماریت احدا من الفقهاء یکره النظر فی قوله " ۱۶

میں اور ابومسلم المستملی زید بن ہارون کے پاس گئے ، وہ منصور بن المہدی کے پاس بغداد میں مہمان تھے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرے میں پہنچے جس میں وہ تشریف فرما تھے۔ ابومسلم نے ان سے کہا "اے ابوخالد، آپ ابوحنیفہ اور ان کی کتب کے مطالعہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ فرمایا: اگر چاہتے ہو کہ تم میں تفقہ پیدا ہو تو ان کی کتابیں دیکھو۔ میں نے تو فقہاء میں سے کسی کو ان کے اقوال کے مطالعہ کو ناپسند کرتا نہیں دیکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ نہ صرف دورِ اول کے کثیر التصانیف مصنف تھے، بلکہ ان کی کتب اس قدر بلند پایہ تھیں کہ اس دور کے تمام اکابر ائمہ فقہ واجتہاد ان سے استفادہ کرتے تھے۔ امام صاحب کی کتب کے ساتھ یہ اعتناء اور شغف صدیوں تک رہا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوریؒ رقم طراز ہیں:

''امام صاحب کی کتابوں کے ساتھ اعتناء وشغف کا یہ حال تھا کہ پانچویں صدی کے ایک عالم کو زبانی یاد تھیں، اور ان کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا سے یہ کتابیں ناپید ہوجائیں تو میں ان کو اپنی یاد داشت سے لکھوا سکتا ہوں۔ سمعانی نے قاضی ابو عاصم محمد بن احمد عامری مروزی متوفی ۴۱۵ھ کا قول نقل کیا ہے: "لو نفدت کتب ابی حنیفة رحمه الله لأملیتها من نفسی." یعنی ''اگر امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں مٹ جائیں تو میں اپنی یاد داشت سے اسے املا کروادوں۔'' ۱۷

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس دور کے فقہاء ومحدثین کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ وشیوخ کی کتابوں کو ضبط کر کے روایت کیا جس کی وجہ سے ان کی کتابوں کا شمار تلامذہ کی تصانیف میں ہونے لگا۔ جیسا کہ اب کتاب الآثار امام ابویوسف اور کتاب الآثار امام محمد کے متعلق محقق ہوچکا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کی تصنیف ہے جس کو آپ سے آپ کے تلامذہ نے روایت کیا۔

امام ابویوسفؒ کے تذکرے میں، ابن خلکان شافعی اور ابن العماد الحنبلی نے لکھا ہے:

"واول من وضع الکتب فی أصول الفقه علی مذهب أبی حنیفة، و أملی المسائل و نشرها، و بث علم أبی حنیفة فی أقطار الارض." ۱۸

''انھوں نے امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر اصول فقہ میں سب سے پہلے کتب تصنیف کیں۔ مسائل املا کروائے اور ان کی اشاعت کی اور امام ابوحنیفہؒ کا علم ہر گوشۂ زمین میں پھیلایا۔''

ابن ندیم نے امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ کے تذکرہ میں ان کی کتب کی فہرست میں کتاب اجتہاد الرای، کتاب الاستحسان اور کتاب اصول الفقہ کا ذکر کیا ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس تدوین فقہ میں اصول فقہ واضح و منقح ہو چکے تھے بلکہ فقہ کی تدوین کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کی باقاعدہ تدوین اور اس کی کتب تصنیف کرنے کا شرف بھی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ ہی کو حاصل ہوا ہے۔

علامہ ابو الوفا الافغانی نے بالکل بجا فرمایا ہے:

وأما أول من صنف فی علم الاصول – فیما نعلم – فهو اِمام الائمة ، و سراج الامة ابو حنیفة النعمان رضی الله عنه حیث بین طرق الاستنباط فی (کتاب الرای) له، و تلاه صاحباه القاضی ، الاِمام أبویوسف یعقوب بن اِبراهیم الأنصاری، و الاِمام الربانی محمد بن الحسن الشیبانی رحمهما الله.[۱۹]

اور جس شخص نے علم اصول (فقہ) میں سب سے پہلے کتاب تصنیف کی ہمارے علم کے مطابق وہ امام الائمہ، سراج الائمہ ابوحنیفہ النعمان رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، انہوں نے اپنی کتاب الرائے میں استنباط کے طریقوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے بعد اصول فقہ میں کتابیں تصنیف کرنے والوں میں ان کے صاحبین امام ابو یوسف ، ابراہیم انصاری اور امام ربانی محمد بن حسن الشیبانیؒ کا نام آتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں شاہ ولی اللہؒ کی جلالتِ شان اور عظمتِ مقام کے باوجود ان کی اس بات سے اتفاق کرنا مشکل ہے:

أنی وجدت بعضهم یزعم أن بناء الخلاف بین أبی حنیفة و الشافعی رحمهما الله علی هذه الأصول المذکورة فی کتاب البزدوی و نحوه ، و انما الحق أن اکثرها اصول مخرجة علی قولهم و عندی ان المسألة القائلة بأن الخاص مبین ولا یلحقه البیان ، و أن الزیادة نسخ

بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان بنائے اختلاف وہ اصول ہیں جو بزدوی کی کتاب وغیرہ میں مذکورہ ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان میں سے بیش تر اصول بعد میں ان ائمہ کے اقوال سے مستنبط کیے گئے ہیں۔ میرے نزدیک بہت سے اصول، مثلاً خاص مبیّن ہے، زیادتی نسخ ہے، عام خاص کے مثل

و أن العام قطعی کالخاص ، و أن لا ترجیح بکثرة الرواة وأنه لایجب العمل بحدیث غیر الفقیه اذا انسد باب الرأی ، و أن لا عبرة بمفهوم الشرط والوصف أصلا و أن موجب الأمر هو الوجوب البتة ، وأمثال ذلک اصول مخرجة علی کلام الائمة، و انه لا تصح بها روایة عن أبی حنیفة و صاحبیه. ۲۰

قطعی ہے، کوئی روایت کثرۃ رواۃ کی بناپر قابل ترجیح نہیں ہے، غیرفقیہ کی حدیث پر عمل ضروری نہیں اگر اس سے رائے کا دروازہ بند ہوجائے، شرط اور وصف کے مفہوم کا اعتبار نہیں، امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے، وغیرہ۔ یہ تمام اصول ائمہ کے کلام سے بعد میں مستنبط کیے گئے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اوران کے صاحبین نے ان کا استنباط کیا ہے، یہ ثابت نہیں ہے۔

علامہ زاہدالکوثریؒ کا اس پر یہ محاکمہ گوسخت ہے، لیکن دلائل پر مبنی اور قابلِ توجہ ہے۔

''مسلک حنفی کے اصول کے بارے میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ متاخرین کے وضع کردہ ہیں۔ انہوں نے خبر احاد سے نص پر زیادتی کو اسی صنف میں شامل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے مناظرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے خود انہی کی بات کی تردید ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (اس معاملہ میں) ان کا مبلغ علم قلیل ہے، ان کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور وہ متقدمین کی کتب سے جن میں کثرت سے مسلک حنفی کے اصول ائمہ قدما سے نقل کیے گئے ہیں، بے خبر ہیں۔ کیا ان کو عیسیٰ بن ابان کی کتاب الحجج الکبیر یا الصغیر، ابو بکر رازی کی الفصول فی الاصول اور اتقانی کی شامل، کتب ظاہر الروایہ کی شروح کی کچھ خبر نہیں۔ اُن کتب میں کثرت سے مسلک حنفی کے اصول ائمہ سے منقول ہیں۔'' ۲۱

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امام مالک بن انسؒ نے بھی اصول فقہ پر کلام فرمایا۔ اس پر ان کی مشہور تالیف موطا شاہد ہے جس میں ان قواعد واصول کی طرف اشارہ ملتا ہے جو دوران اجتہاد و استنباط ان کے پیش نظر ہوتے تھے۔ اسی طرح ان کی وہ مکاتبت بھی جو

فقیہ مصر حضرت لیث بن سعدؒ سے ہوئی، بطورِ مثال پیش کی جاسکتی ہے۔لیکن آپ نے اجتہاد واستنباط کے اصول وقواعد کو کسی مستقل کتاب کی صورت میں مدوّن فرمایا ہو، اس کا سراغ نہیں ملتا۔

ڈاکٹر عبدالوہاب ابوسلیمان فرماتے ہیں:

''مالکیہ کی رائے ہے کہ امام مالکؒ نے سب سے پہلے اصول فقہ اور غریب الحدیث میں کلام کیا ہے اور اپنی موطا میں کثرت سے ان کو بیان کیا ہے۔لیکن مالکیہ، امام مالک کی اصول فقہ میں مستقل تالیف کا دعویٰ نہیں کرتے۔ بے شک وہ اولین لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اصول فقہ میں سب سے پہلے کلام کیا۔ ہم نے ان کی لیث بن سعد سے مکاتبت کا ذکر پہلے کیا ہے۔جو کہ اصول (فقہ) کی تدوین کے آغاز (کے) نمونہ (کے طور پر پیش کی جاسکتی) ہے۔''[۲۲]

حاصل بحث یہ کہ جس طرح فقہ کی باقاعدہ تدوین کا آغاز حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ نے کیا، اسی طرح اصول فقہ یعنی استنباط و استخراج کے میدان میں بھی باقاعدہ تصنیف وتالیف میں اولیت کا شرف حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ امام ابویوسف و امام محمد کو حاصل ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ڈاکٹر عبدالوہاب سلیمان، الفکر الاصولی، دارالشروق، جدہ، طبع دوم ۱۹۸۴ء، ص:۶۰

۲۔ ابن حزم اندلسی، الاحکام فی اصول الاحکام، دارالحدیث بجوار ادارہ الازہر، مصر، ۱۹۸۴ء، ۱(۱۱)/ ۲۳۷

۳۔ الکوثری، علامہ زاہد، فقہ اہل العراق وحدیثھم، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۰۱ھ، ص:۵۵

۳الف حوالہ سابق

۴۔ شبلی نعمانی، سیرت النعمان، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، س۔ن، ص۲۲۷

۵۔ فقہ اہل العراق وحدیثھم، ص: ۵۵۔۵۶

۶ الکوثری، علامہ زاہد، حسن التقاضی فی سیرۃ الامام ابو یوسف القاضی، ایچ ایم سعید کمپنی، طبع دوم، ۱۴۰۳ھ، ص:۱۳

۷ ایضاً

۸ ایضاً، بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن حسن الشیبانی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۰۰ھ، ص:۱۸

۹ ابن حجر مکی، الخیرات الحسان، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۱۴۰۱ھ، ص:۲۳۔۲۴

۱۰ فقہ اہل العراق وحدیثھم، ص:۵۶۔۵۷

۱۱ یسأله ان یحمل الیه شیئا من کتب ابی حنیفة ففعل، الدمشقی، محمد یوسف صالح، عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۴۰۰ھ، ص:۱۸۶

۱۲ بلوغ الامانی، ص:۱۸

۱۳ مجلّہ برھان، ج۔۱۰۰، شمارہ ۵، ص:۱۷، بحوالہ اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۸۱

۱۴ ایضاً، ص:۱۸۔۱۹، بحوالہ اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۷۸

۱۵ ایضاً

۱۶ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مکتبہ العربیہ بغداد، ۱۹۳۱ء، ۳۴۲/۱۳

۱۷ مجلّہ برہان، ج۔۱۰۰، ش:۵، ص:۲۵۔۲۶

۱۸ ابن خلکان، وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، دار الثقافۃ بیروت، ۱۳۲۲ھ، ۳۸۲/۶، شذرات الذھب، ۳۰۱/۱

۱۹ فقہ اھل العراق وحدیثھم، ص ۵۶

۲۰ امام بزدوی، اصول السرخسی، تحقیق ابوالوفا الافغانی، دار المعارف النعمانیہ، طبع اول ۱۹۸۱ء، ص ۳

۲۱ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، دار التراث، قاہرہ، طبع اول، ۱۳۵۵ھ، ۱۶۰/۱

۲۲ حسن التقاضی، ص ۹۸

وحی پر مبنی دین☆

مولانا محمد جرجیس کریمی

دنیا میں سینکڑوں مذاہب ونظریات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ الہامی ہیں، یا ان کا نزول اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ اسلام کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن اور اس کی تعلیمات اس عظیم ذات کی نازل کردہ ہیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک اور رب ہے، علام الغیوب اور اپنی مخلوقات کی جملہ ضروریات کا جاننے والا ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں ساری کائنات ہے اور اس کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ اس سلسلے کی بعض تصریحات ملاحظہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنَّکَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ. (النمل:٦)

اے (نبیؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم وعلیم ہستی کی طرف سے پارہے ہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

الم . تَنزِيلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ. (السجدہ:۱-۲)

ا-ل-م- اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ [1]

قرآن مجید کا نزول شروع ہوا اور اس کی آیات اہل مکہ کے کانوں تک پہونچنے لگیں تو وہ ان کی مختلف توجیہات کرنے لگے۔ کبھی کہتے کہ محمد (ﷺ) جو کلام سنا رہے ہیں وہ ایک طرح کی شاعری ہے، کبھی کہتے کہ یہ جنون کی حالت میں کہی ہوئی باتیں ہیں، کبھی اسے گذشتہ قوموں کی کہانیاں تو کبھی شیطان کے کلام سے تعبیر کرتے۔ قرآن نے

☆ زیر تصنیف کتاب 'خصائص اسلام' کا ایک باب

[1] مزید ملاحظہ کیجیے الاسراء:۱۰۲- الفرقان:۱۔ یونس:۳۷ وغیرہ

ان سب باتوں کی پرزور تردید کی اور واضح کیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَـرٰهُ وَأَعَـانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَـاؤُوا ظُـلْماً وَزُوراً. وَقَالُوا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْـنَ اكْتَتَبَهَـا فَهِـيَ تُـمْـلَى عَلَيْـهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلاً. قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّـرَّ فِـيْ السَّـمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِنَّـهُ كَانَ غَفُوراً رَّحِيْماً. (الفرقان:۴-۶)

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے اپنے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہے۔ اے نبی، ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے، بے شک وہ بڑا غفور اور رحیم ہے۔

اس کے کلام شیاطین ہونے کی تردید ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَمَـا تَـنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ. وَمَا يَنبَغِيْ لَهُـمْ وَمَـا يَسْتَـطِيْعُـونَ. إِنَّهُـمْ عَـنِ السَّـمْعِ لَمَعْزُولُونَ. (الشعراء:۲۱۰-۲۱۲)

اس (کتاب مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں اور نہ یہ کام ان کو زیب دیتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔

شاعری کے الزام کے بارے میں کہا گیا:

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيْمٍ. وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَـاعِرٍ قَـلِيْلاً مَـا تُؤْمِنُونَ. وَلَا بِقَوْلِ كَـاهِـنٍ قَلِيْلاً مَا تَذَكَّرُونَ. تَنزِيْلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ. (الحاقۃ:۴۰-۴۳)

یہ ایک رسول کریم کا قول ہے۔ کسی شاعر کا قول نہیں ہے تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

قرآن میں مختلف انبیاء و رسل اور ان کی قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں جو وحی کے ذریعے بتائی

جارہی ہیں، جن کے بارے میں صحیح علم، اے پیغمبرؐ نہ آپ کو پہلے تھا اور نہ آپ کی قوم اس سے واقف تھی۔ ارشاد ہے:

تِلْکَ مِنْ أَنبَاء الْغَیْبِ نُوحِیْهَا إِلَیْکَ مَا کُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلاَ قَوْمُکَ مِن قَبْلِ هَـذَا . (ہود:۴۹)

اے نبیؐ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھاری طرف وحی کررہے ہیں اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم۔

نبی کریم ﷺ پر قرآن کا نزول ہونے لگا تو اہل کتاب نے مختلف اعتراضات کیے۔ قرآن نے ان کے جواب میں یہ دلیل پیش کی کہ تم لوگ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ان سے قبل کے انبیاء کے سلسلہ میں مانتے ہو کہ وہ اللہ کے رسول تھے اور ان پر وحی نازل ہورہی تھی، مگر وہی وحی محمد ﷺ پر اتاری جارہی ہے تو اس کا انکار کرتے ہو۔ ان سے قبل کے انبیاء پر وحی آتی تھی تو ان پر وحی کا نزول کیوں نہیں ہوسکتا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّـا أَوْحَیْنَـآ إِلَیْکَ کَـمَا أَوْحَیْنَا إِلَی نُـوحٍ وَالنَّبِیِّیْنَ مِن بَعْدِهِ وَأَوْحَیْنَا إِلَی إِبْـرٰهِیْمَ وَإِسْمٰعِیْلَ وَإِسْحٰقَ وَیَعْقُوبَ وَالأَسْبَـاطِ وَعِیْسَـی وَأَیُّوبَ وَیُونُسَ وَهٰـرُونَ وَسُـلَیْمٰـنَ وَآتَیْنَـا دَاوُودَ زَبُوراً. وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْکَ مِن قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْکَ وَکَلَّـمَ اللّـهُ مُـوسَی تَکْلِیْماً. رُّسُلاً مُّبَشِّـرِیْنَ وَمُنذِرِیْنَ لِئَلاَّ یَکُونَ لِلنَّاسِ عَـلَی اللّـهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّهُ عَزِیْزاً حَکِیْماً.

(النساء:۱۶۳-۱۶۵)

اے نبی ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف بھیجی۔ ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کرچکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ اللہ نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تاکہ ان کو مبعوث کردینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے چالیس سال تک معمول کی زندگی گزاری، پھر جب آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز کیا گیا اور آپؐ پر وحی کا نزول ہوا تو اہل مکہ حیرت وتعجب کا اظہار کرنے لگے۔ اس پر آپؐ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کہ ذرا سوچو! چالیس سال تک میں تمھارے درمیان رہا ہوں، لیکن اس سے قبل میں نے تمھیں ایسا کلام کبھی نہیں سنایا۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ نہ ہوتا اور مجھے سنانے کا حکم نہ دیا جاتا تو آج بھی میں تمھیں اسے نہ سناتا۔ میں تو حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ فریضے کو ادا کر رہا ہوں۔ اس میں اپنی خواہش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

قُل لَّوْ شَاء اللّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلآ أَدْرَكُم بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّن قَبْلِهِ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ. (یونس:۱۶)

کہو اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

قرآن مجید میں نوع انسانی کے لیے اعلیٰ تعلیمات پیش کی گئی ہیں، توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد بیان کیے گئے ہیں، نیز کفر، شرک اور نفاق کی شدید مذمت کی گئی اور ان کے خلاف دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ کفار مکہ نے اس پر سخت ناگواری اور نبی کریم ﷺ کے خلاف بغض وعناد کا مظاہرہ کیا اور آپ کو مختلف طریقوں سے اذیتیں پہنچائیں۔ وہ آپ سے مطالبہ کرتے کہ قرآن کی تعلیمات میں تھوڑی سی تبدیلی کر دیں اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ان کے سامنے دوٹوک انداز میں واضح کر دیا کہ یہ تعلیمات میری خود ساختہ نہیں ہیں، بلکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہیں:

وَإِذَا تُتلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لاَ يَرْجُونَ لِقَاءنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَـذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَآئ نَفْسِيْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلاَّ مَا

جب انھیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کر دو، اے نبیؐ ان سے کہو: میرا یہ کام نہیں ہے کہ

يُوحٰى إِلَيَّ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (یونس:۱۵)

اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کرلوں، میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جب اہل مکہ کے سامنے قرآنی آیات پیش کرنی شروع کیں تو وہ آپؐ سے مختلف مطالبات کرنے لگے۔ کبھی کہتے کہ اگر آپؐ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے تو اس سے کہیے کہ وہ آسمان سے خزانے بھی نازل کرے، یا آسمان سے فرشتوں کو اتارے جنھیں ہم دیکھ سکیں، یا ایسی تختیاں بھیجے جنھیں ہم پڑھ سکیں۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہیں۔ نبیؐ کا کام بس یہ ہے کہ اسے اللہ کی طرف سے جو احکام ملیں ان کی تعمیل کرے:

قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلآ أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّيْ مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ. (الانعام:۵۰)

اے نبیؐ ان سے کہو ''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔

مزید ملاحظہ کیجیے سورۂ ہود:۱۲۔

اہل مکہ سمجھتے تھے کہ وحی کا نزول ایسے شخص پر ہونا چاہیے جو دنیاوی اعتبار سے اثر و رسوخ رکھنے والا ہو، اس کی بڑی شہرت ہو، معاشی اعتبار سے وہ نمایاں حیثیت کا مالک ہو۔ محمد (ﷺ) کو یہ چیزیں حاصل نہیں ہیں اس لیے آپ اللہ کے رسول نہیں ہوسکتے، آپ پر وحی کا نزول ممکن نہیں۔ قرآن نے اس کا مدلّل جواب دیا اور بتایا کہ نبوت و رسالت کسی کے ذاتی اختیار و انتخاب کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جس میں کسی کی خواہش و آرزو یا اعتراض و انکار کا دخل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ. أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ.

(الزخرف:۳۱-۳۲)

کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزربسر کے ذریعے تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ پر وحی کے نزول پر اہل مکہ کو سب سے بڑا اشکال یہ تھا کہ وہ ہماری طرح کے ایک انسان ہیں، کھاتے پیتے ہیں، شادی بیاہ کر رکھی ہے، ان کے بال بچے ہیں، وہ ہماری طرح بیمار پڑتے ہیں اور ضروریات زندگی کے محتاج ہیں۔ بھلا ان پر وحی کا نزول کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ وحی کا نزول کسی مافوق الفطرت ہستی، جن یا فرشتے پر ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا اور واضح کیا کہ انسانوں کے لیے جن رسولوں کو بھی بھیجا گیا وہ انہی میں سے ہوتے تھے۔ اگر اللہ چاہتا تو فرشتے بھی بھیج سکتا تھا، مگر یہ اس کے طریقے کے خلاف ہوتا۔ اس لیے کہ انسانوں کی ہدایت انسانوں ہی کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَى إِلَّا أَن قَالُوا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَراً رَّسُولاً. قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكاً رَّسُولاً.[1]

(الاسراء ۹۴-۹۵)

لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا، مگر ان کے اسی قول نے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا۔ ان سے کہو: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

---

[1] بشریتِ رسول کو واضح کرنے والی قرآن میں متعدد آیات ہیں۔ دیکھیے الفرقان:۷۔ المومنون:۳۳۔ یوسف:۱۰۹ وغیرہ

اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل کی بشریت کو دوٹوک انداز میں واضح کیا ہے اور منکرین رسالت کے اشکالات کا جواب دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَکَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِیْ إِلَیْهِمْ فَسْئَلُوآ أَهْلَ الذِّکْرِ إِن کُنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ. وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَداً لَّا یَأْکُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوا خٰلِدِیْنَ. (الانبیاء:۷-۸)

اے نبیؐ ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں۔ جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔

قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں نہ صرف قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا دعوی کیا گیا ہے، بلکہ اس پر دلیل بھی قائم کی گئی ہے اور انس و جن کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کتاب کو محمد (ﷺ) کا خود ساختہ قرار دیتے ہیں تو اس جیسا کلام خود تصنیف کر کے دکھائیں۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن یَأْتُواْ بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ یَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْراً. (الاسراء:۸۸)

کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک دوسری جگہ قرآن کی مرتب و منظّم تعلیمات کا حوالہ دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی دی ہوئی ہوتیں تو ان میں بہت سارے اختلافات ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَلاَ یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِندِ غَیْرِ اللّهِ لَوَجَدُواْ فِیْهِ اخْتِلاَفاً کَثِیْراً. (النساء:۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

---

۱ لسان العرب لابن منظور، مادہ وحی، النہایۃ فی غریب الحدیث لابن الاثیر الجزری، مفردات القرآن للاصفہانی

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ اتارا گیا ہے۔ ذیل میں مختصراً قرآن کے اتارے جانے کی مختلف کیفیات اور اس بارے میں قرآن میں مستعمل بعض اصطلاحات کی تشریح کی جاتی ہے۔

نبوت و رسالت کا آغاز نزول وحی سے ہوتا ہے۔ قرآن میں اس اصطلاح کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وحی کے معنیٰ و مفہوم کو واضح کر دیا جائے۔

وحی کے معنیٰ

وحی کے لغوی معنیٰ ہیں لطیف اور مخفی اشارہ، دل میں کوئی پیغام ڈالنا، چھپ کر بات کرنا، کتابت، کتاب اور مکتوب۔ اہل لغت کے نزدیک وحی کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ کسی سے اس طرح چپکے چپکے باتیں کی جائیں کہ کوئی دوسرا نہ سن پائے۔[۱]

وحی کے اصطلاحی معنیٰ ہیں وہ غیبی ذریعہ جس کے سبب اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم اور فضل و عنایت سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کے حصول میں کسی نبی یا رسول کے اپنے غور و فکر، کوشش اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بنیادی طور پر وحی کی دو اقسام ہیں: وحی عام اور وحی خاص، وحی عام کا اطلاق وحی کے لغوی معنیٰ میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشادات:

وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ . (القصص: ۷)	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اسے دودھ پلاؤ۔
وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي. (المائدۃ:۱۱۱)	اور جب میں نے (عیسیٰ کے) حواریوں کو بذریعہ الہام (حکم دیا کہ) مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔
وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ. (الانعام:۱۲۱)	اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں چپکے چپکے (شک و اعتراض کی) باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔

وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ. (النحل:۶۸)

آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو القا کیا کہ تو گھر بنا پہاڑوں میں، درختوں میں اور انگور کی بیلوں میں۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا. بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحٰى لَهَا. (الزلزال:۴-۵)

اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی۔ یہ اس لیے کہ آپؐ کے رب نے اسے یہی حکم دیا ہے۔

ان تمام آیات میں لفظ وحی اپنے لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

وحی کی دوسری قسم وحی خاص ہے جو صرف انبیاء و رسل کو کی جاتی ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ وحی خاص یا وحی نبوت اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دوسری تمام اقسام وحی سے مختلف ہوتی ہے اور نبی کو پورا یقین اور شعور ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یہ وحی علم و ہدایت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں قصص، اخبار، عقائد، عبادات، احکام اور قوانین سب شامل ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد نبی کے ذریعے سے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنٰهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. (الشوریٰ:۵۲)

اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمھاری طرف وحی کی ہے، تمھیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

وحی کے طریقے

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں وحی کے متعدد طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ. (الشوری:۵۱)

اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہو مگر بذریعہ وحی یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے، پس وہ اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہے وحی پہنچادے، بے شک اللہ تعالیٰ عالی شان اور حکمت والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے خطاب کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں:

۱- بذریعۂ الہام: اللہ تعالیٰ براہ راست رسول و نبی کے دل میں بات ڈالتا ہے چاہے نیند کی حالت میں ہو یا بیداری کی حالت میں۔ مجاہد کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے دل میں 'زبور' القا کیا تھا۔ اسی طرح بعض رسولوں کو خواب میں بعض احکام دیے گئے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ پر اس طریقے سے وحی آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَذَلِكَ يُوحِيْ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (الشوری:۳)

اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے۔

۲- بواسطۂ حجاب- اللہ تعالیٰ براہ راست اپنے نبی سے کلام کرتا ہے، مگر حجاب کے واسطہ سے۔ چاہے اللہ کا یہ کلام زمین میں واقع ہو، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔[۱] یا آسمان میں جیسے معراج کے موقع پر ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔[۲]

۳- بذریعۂ فرشتہ: وحی کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغام فرشتے کے ذریعے سے بھیجتا ہے۔[۳] ان اقسام کے حوالے سے امام رازی فرماتے ہیں:

---

[۱] النساء:۱۶۴، الاعراف:۱۴۳

[۲] النجم:۱۰

[۳] علماء نے وحی کی ایک چوتھی قسم بھی بیان کی ہے اور وہ ہے بلا واسطۂ حجاب یعنی اللہ تعالیٰ تمام واسطوں، پردوں اور حجابوں کو اٹھا کر جلوہ نما ہوا اور اپنے نبی سے ہم کلام ہو۔ وحی کے اس طریقے پر ان کا اختلاف ہے کہ یہ ممکن ہے یا نہیں؟ بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ معراج کے موقع پر رسول کریم کو اللہ تعالیٰ کے روبرو ہو کر ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا، جب کہ بعض علماء رویت بصری سے انکار کرتے ہیں۔

واعلم ان کل واحد من هذه الاقسام الثلاثة وحی، الا أنه تعالیٰ خصّص القسم الاول باسمه الوحی لانّ ما یقع فی القلب علی سبیل الإلهام فهو یقع دفعة، فکان تخصیص لفظ الوحی به اولیٰ، فهذا هوالکلام فی تمییز هذه الاقسام بعضها عن بعض. [1]

جان لو کہ ان میں سے تینوں قسمیں وحی ہیں مگر آیت میں پہلی قسم کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دل میں الہام کے طریق پر اچانک واقع ہوتی ہے۔ بنا بریں اس کو وحی کے لفظ سے خاص کیا گیا ہے۔ اور ان اقسام میں باہم تمییز کی یہی صورت ہے۔

وحی کے بنیادی طور پر یہی تین طریقے ہیں۔ احادیث میں اس کے نزول کی بعض کیفیات کا ذکر ہوا ہے۔ ذیل میں اس کی تھوڑی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ اس سے اس بحث کی مزید وضاحت ہوگی۔

۱- رویائے صادقہ یعنی سچے خواب[2] آپؐ پر وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا،

---

[1] التفسیر الکبیر بذیل آیت مذکورہ ج۲۱-۲۸/۱۶۵

[2] خوابوں کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ احادیث میں کہا گیا ہے کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی طرف سے، دوم شیطان کی طرف سے اور سوم آدمی کے اپنے نفس کی طرف سے۔ ایک روایت میں وارد ہے: الرؤیا الصادقة من الله والحلم من الشیطان (بخاری، کتاب التعبیر، باب الرویا من اللہ) [سچے خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے]۔ ایک دوسری روایت میں وارد ہے: الرویا الحسنة من الرجل الصالح جزء من ستة و اربعین من النبوة (حوالہ سابق، باب رؤیا الصالحین) [اچھے خواب صالح شخص کو نظر آتے ہیں جو نبوت کا ۴۶ واں حصہ ہے]۔ اس روایت کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نبوت سے قبل نبی کریم ﷺ کو نظر آنے والے خواب رجل صالح کے خواب ہوتے تھے۔ روایت مذکورہ کے ذیل میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں: "المسلم الصادق الصالح هو الذی یناسب حاله حال الانبیاء فاکرم بنوع مما اکرم به الأنبیاء وهو الاطلاع علی الغیب ولو صدقت رؤیا الکافر والفاسق احیانا فذاک کما قد یصدق الکذوب، ولیس کل من حدث عن الغیب یکون خبره من اجزاء النبوة کالکاهن والمنجم"۔ (حوالہ سابق، حاشیہ نمبر ا، مطبوعہ المکتبة السلفیة القاهرة) [سچے صالح مسلم کا حال انبیاء کے حال کے مثل ہے جس طرح انبیاء کو غیب کی خبریں بتائی جاتی ہیں ویسے ہی رجل صالح کو غیب کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض وقت کافر و فاسق کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں تو یہ ایسے ہی جیسے بہت جھوٹا شخص بھی بعض وقت سچ بولتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ غیب کی خبر دینے والے ہر شخص کی بات نبوت کے اجزاء میں سے ہو جیسے کاہن اور نجومی]۔

آپؐ جو خواب دیکھتے وہ دن کے اجالے کی طرح حقیقت بن کر نظر آجاتا۔ صحیح بخاری میں ایک روایت اس طرح وارد ہے:

عن عائشة ام المومنین انها قالت اول ما بدئ به رسول الله ﷺ من الوحی الرویا الصالحة فی النوم. فکان لایری رویا الاجاءت مثل فلق الصبح۔[۱]	حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے نبی کریم ﷺ پر وحی کا آغاز سچے خواب کی شکل میں ہوا۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے اس کی سچائی دن کے اجالے میں حقیقت بن کر سامنے آجاتی۔

۲- بغیر نظر آئے فرشتہ آپ کے قلب و ذہن میں کوئی بات ڈال دیتا تھا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ روح القدس (حضرت جبریل) نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنا حصۂ رزق پورا نہ کرلے لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو اور طلب رزق کے لیے اچھا طریقہ اختیار کرو۔ [۲]

۳- نزول وحی کے وقت گھنٹی کی سی آواز (صلصلۃ الجرس) پیدا ہوتی۔ یہ شدید ترین صورتِ وحی ہوتی تھی، جس کی وجہ سے سخت سردی کے موسم میں بھی آپ پسینے سے تر ہو جاتے تھے۔ اگر آپؐ اونٹ پر سوار ہوتے تو وہ بھی بوجھ سے بیٹھ جاتا تھا۔[۳]

۴- فرشتہ کسی انسان کی شکل و صورت میں نمودار ہوکر آپؐ سے بات کرتا، یہاں تک کہ وہ بات مکمل طور پر آپؐ کو یاد ہوجاتی۔ اس صورت میں کبھی کبھی صحابہ کرامؓ نے بھی اس فرشتے کو دیکھا ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل سے معلوم ہوتا ہے۔[۴]

۵- فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا اور اللہ تعالیٰ کا پیغام آپؐ تک پہونچاتا تھا۔ آپؐ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دو تین مرتبہ مشاہدہ فرمایا ہے (دیکھیے

---

[۱] بخاری، کتاب بدء الوحی، باب ۳

[۲] المستدرک للحاکم، ج ۲/۴، کتاب البیوع

[۳] بخاری، کتاب بدء الوحی، باب ۲

[۴] دیکھیے بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام، والاحسان، وعلم الساعۃ الخ

النجم:۱۳) ایک مرتبہ غار حرا میں پہلی وحی کے وقت، پھر فترۃ وحی کے آخری دن فضائے آسمانی میں کرسی پر بیٹھے ہوئے اور تیسری مرتبہ معراج کے وقت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔

۶- کسی فرشتے یا آواز کے توسط کے بغیر اللہ تعالیٰ کا راہ راست اپنے نبی پر وحی کرنا۔ جیسا کہ معراج کے موقع پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز پنج گانہ کی فرضیت اور دیگر احکام دیئے گئے۔

وحی خاص کی قسمیں

وحی کے معنیٰ 'موحیٰ بہٖ' (یعنی وہ احکام جو بہ ذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں) کے ہیں۔ اس اعتبار سے وحی خاص کی دو قسمیں ہیں: وحی متلو اور وحی غیر متلو۔

(الف) وحی متلو: وحی متلو سے مراد قرآن مجید ہے، جس کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں جس میں تصرف کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَلَمِينَ . نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ . (الشعراء:۱۹۲-۱۹۳) — یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ روح الامین اس کو لے کر اترتے ہیں۔

اس وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تلاوت خواہ حالت نماز میں ہو یا غیر نماز میں، عبادت اور باعث اجر ہے۔ اس کی روایت بالمعنیٰ قطعاً جائز نہیں۔

(ب) وحی غیر متلو: وحی غیر متلو سے مراد وہ کلام ہے جو مروی اور منقول ہے اور قرآن کی طرح دو دفتیوں کے درمیان مرتب و منظم نہیں ہے۔ وحی کی یہ قسم رسول کریم ﷺ سے مروی اخبار پر مبنی ہے، جس کی تلاوت باعث اجر و ثواب نہیں ہے اور اعجاز سے خالی ہے، لیکن بہر حال وہ بھی وحی پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى. (النجم:۳-۴) — وہ (رسول) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں کتاب کے ساتھ حکمت کا حوالہ آیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ ارشاد ہے:

وَأَنزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْماً۔[۱] (النساء:۱۱۳)

اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور آپ کو وہ باتیں بتلائیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپؐ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں اور اس جیسی دوسری آیات میں کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت نبویؐ ہے۔ حافظ امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

الكتاب هو القرآن والحكمة هي السنة باتفاق السلف.[۲]

کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ سلف کے اس پر اتفاق ہے۔

خود نبی کریم ﷺ نے اپنے بعض ارشادات میں اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ قرآن کے ساتھ مجھے ایک چیز اور دی گئی ہے۔ حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ألا إني اوتيت الكتاب ومثله معه، ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه وما وجدتم فيه حرام فحرموه.[۳]

آگاہ رہو مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل ایک اور چیز، ممکن ہے ایک آسودہ شکم شخص مسند سے ٹیک لگا کر یوں کہے کہ قرآن کا دامن تھامے رہو جو چیز اس میں حلال ہو اس کو حلال سمجھو اور جو حرام ہو اسے حرام سمجھو۔

مثله معه سے مراد سنت ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے امام بیہقی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جس طرح قرآن کی آیات لے کر

---

[۱] ایسی متعدد آیات ہیں جن میں کتاب کے ساتھ حکمت عطا کیے جانے کی بات ہی کہی گئی ہے۔ دیکھیے الاحزاب:۳۴ - الجمعہ:۲، وغیرہ

[۲] کتاب الروح، ص۱۱۹، طبع ثانی حیدرآباد الدکن

[۳] ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ

اترتے تھے اسی طرح احادیثِ نبویہ بھی لے کر اترتے تھے۔ روایت ہے:

کان جبرئیل ینزل علی النبی ﷺ بالسنة کما ینزل علیه بالقرآن۔[1]	حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس سنتوں کو لے کر آتے تھے جیسے قرآن کی آیات لے کر آتے تھے۔

حدیث کے وحی ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپؐ وحی کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ پر وحی کا نزول ہوتا اور اس مسئلے کی آپؐ توضیح فرماتے تھے اور یہ وضاحتیں قرآن کی آیات کے علاوہ ہوتی تھیں۔ روایات میں ایسے متعدد واقعات ہیں۔[2]

بہرحال اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جس طرح قرآن شریعت کی بنیاد ہے اور وحی پر مبنی ہے اسی طرح سنتِ رسول یا احادیثِ رسول بھی شریعت کی بنیاد ہیں اور وہ بھی وحی پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں اطاعت رسول کا مطلق حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (الحشر:۷)	اور رسول تمھیں جو کچھ بھی دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ۔ (التغابن:۱۲)	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچادینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔

قرآن میں ایسی متعدد آیات ہیں جن میں اطاعت رسولؐ کا مستقل حکم دیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے آل عمران: ۳۲، ۱۳۲- النساء:۵۹- المائدۃ:۹۲، الانفال:۱، ۲۰، ۶۴- النور:۵۴ وغیرہ۔

---

[1] فتح الباری ۱۳/۲۹۱

[2] ایضاً، ۱۳/۲۹۱

وحی کے مترادف الفاظ

نزولِ قرآن کی کیفیت کے اظہار کے لیے لفظ وحی کا استعمال بطور اصطلاح کثرت سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسری اصطلاحیں بھی مستعمل ہیں۔ ذیل میں ان کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔

۱- نزول، تنزیل، انزال: اتارنا، نازل کرنا، قرآن میں یہ اصطلاح بھی کثرت سے آئی ہے۔ نزول کے لفظ میں بلندی سے پستی کی طرف اتارنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ تنزیل میں رفتہ رفتہ اتارنے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جبرئیل قرآن کو آسمان سے لے کر زمین پر اترتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ. عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ. (الشعراء:۱۹۲-۱۹۴)

یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو ڈرانے والے ہیں۔

۲- ارسال، ترسیل، رسالت: بھیجنا، اللہ تعالیٰ اپنا پیغام حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے بھیجتا تھا۔ ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ. (الانبیاء:۲۵)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے۔ اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

رسالت و نبوت کے منکرین بھی جانتے تھے کہ رسولوں کے پاس پیغام لے کر فرشتے آتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کے پاس جو پیغام آتا ہے اس کو ہم نہیں مانتے۔ ارشاد ہے:

وَقَالُوٓاْ إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِۦ. (ابراہیم:۹)

انھوں نے کہا جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے۔

۳- قصّ ،قصص: قصہ بیان کرنا، واقعہ بتانا۔ نبی کریم ﷺ کو وحی کے ذریعے انبیائے سابقین کے قصص بتائے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ. (الکہف:۱۳) ہم ان کا اصل قصہ تمھیں سناتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ. (ھود:۱۲۰) اور اے نبیؐ یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔

۴- نبوت: نبوت رسالت کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ. (الانعام:۸۹) وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔

۵- ندا: پکارنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کو بعض وقت پکارنے کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى. إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى. (النازعات:۱۵-۱۶) کیا تمھیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طوی وادی میں پکارا تھا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا. (الصآفات:۱۰۴) اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

۶- قرأ، قراءت: پڑھنا۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے پیغام کو رسول کے سامنے پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ اس کو قراءت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. إِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ. فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ. ثُمَّ إِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ. (القیامۃ:۱۶-۱۹)

اے نبی اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی. إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی. (الاعلیٰ:۶-۷)

اور ہم تمھیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے، سوائے اس کے جو اللہ چاہے وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو پوشیدہ ہے اس کو بھی۔

۷- تلاوت: وحی کو قرآن کے بعض مقامات پر 'تلاوت' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَإِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ. (البقرہ:۲۵۲)

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور اے محمدؐ تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

نَتْلُوا عَلَیْکَ مِن نَّبَإِ مُوسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُؤْمِنُونَ. (القصص:۳)

ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمھیں سناتے ہیں، تاکہ ایمان لانے والے ایمان لائیں۔

۸- اِلقاء: دینا، بتانا۔ وحی کو القاء کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ. (النمل:۶)

اور (اے نبیؐ) بلا شبہ یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ. (المومن: ۱۵)

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح (وحی) نازل کردیتا ہے، تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کردے۔

۹- تعلیم: سکھانا۔ وحی کا اطلاق تعلیم پر بھی ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الرَّحْمٰنُ. عَلَّمَ الْقُرْآنَ. (الرحمٰن:۱-۲)

نہایت مہربان خدا نے علم سکھایا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالإِنجِيلَ. (المائدہ:۱۱۰)

میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔

خصائصِ وحیِ محمدیؐ

بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے وحی کا جو سلسلہ پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اختتام پذیر ہوا۔ اس دوران ہزاروں انبیاء ورسل مبعوث ہوئے جنھوں نے اپنی اپنی قوموں کو ہدایت کا پیغام سنایا۔ یہاں تک کہ حضرت محمد ﷺ پر دین کی تکمیل کا اعلان ہوا اور سلسلۂ وحی اب قیامت تک کے لیے موقوف کردیا گیا۔ قرآن کی شکل میں قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت کا سامان کردیا گیا ہے۔ اب کوئی نیا نبی اور رسول مبعوث ہونے والا نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وحی محمدیؐ کی حقیقت کی معرفت حاصل کی جائے اور اس پر ایمان لایا جائے۔ اسی پر انسانیت کی کامیابی اور نجات کا دار و مدار ہے۔ ذیل میں وحی محمدی کے چند خصائص کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱- وحی کا نزول پیشگی توقع کے بغیر

حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تاریخ وسیرت کی کتابوں میں جو تفصیلات مندرج ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ چالیس سال کی عمر تک آپؐ نے ایک عام انسان کی

طرح سادہ زندگی گزاری۔ اپنی رفیقۂ حیات کے مال سے تجارت کے کاموں میں مصروف رہتے اور اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت کررہے تھے۔ آپ قطعی طور پر اس کے متمنی، متوقع اور تیاری میں نہیں تھے کہ آپ کو نبوت و رسالت ملنے والی ہے۔ طبیعت میں تحنث (عبادت گذاری) کے رجحانات پائے جاتے تھے۔ اس بنا پر آپؐ غارِ حرا میں جا کر گوشہ نشیں ہو جاتے اور کائنات پر غور و فکر کرتے۔ اسی دوران ایک دن اچانک وحی کے فرشتے حضرت جبرئیل نمودار ہوئے اور آپ کو نبوت سے سرفراز کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَى إِلَيْكَ الْكِتٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ. (القصص:۸۶)	اور اے پیغمبرؐ، تمھیں امید نہ تھی کہ تم پر یہ کتاب نازل ہوگی، مگر تمہارے پروردگار کی رحمت اور مہربانی سے نازل ہوئی۔ سو تم ہرگز کافروں کی تائید نہ کرنا۔

مزید ملاحظہ کیجیے سورۂ یونس:۱۶ اور سورۂ شوریٰ:۵۲۔

آپؐ پر جب غار حرا میں پہلی بار وحی کا نزول ہوا تو آپؐ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں گھر تشریف لائے اور اپنی رفیقۂ حیات سے اپنی تشویش کا اظہار کیا، آپ نے گھبراہٹ میں چادر بھی اوڑھ لی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد دوسری بار جب حضرت جبرئیل آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آئے تو اس وقت بھی آپؐ کے اوپر رعب طاری ہوگیا اور آپؐ نے گھبراہٹ کا اظہار کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبوت و رسالت آپؐ کے لیے ایک غیر متوقع چیز تھی۔

۲- نزول وحی کے وقت گرانی

آپ پر جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو چہرۂ مبارک متغیر ہو جاتا، سانسیں تیز چلنے لگتیں، پسینے سے شرابور ہو جاتے، سواری پر بیٹھے ہوتے تو سواری بوجھ سے دب جاتی،

آپؐ کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ یا گھنٹی بجنے کی سی آواز آتی۔ان باتوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ پر وحی کا نزول آپ کے ذاتی اختیار و پسند کے بغیر ہوتا تھا۔

۳-وحی آپ کی ذات سے الگ مستقل چیز تھی

نزول وحی کے وقت آپ پر بعض جسمانی کیفیات طاری ہوتیں ان کے علاوہ بسا اوقات وحی کے انقطاع کا واقعہ بھی پیش آیا۔اس دوران آپؐ اپنی مرضی سے وحی کے نزول پر قادر نہ ہوئے۔اس سلسلے میں فترت وحی کا واقعہ مشہور ہے۔پہلی وحی کے نزول کے بعد کچھ دنوں تک وحی موقوف رہی۔(بعض روایتوں میں ڈھائی تین سال کی مدت بھی بیان کی گئی ہے)اس دوران آپؐ بار بار آسمان کی طرف دیکھا کرتے اور امید کرتے کہ اب دوبارہ وحی نازل ہوگی،مگر دوبارہ فرشتۂ وحی اللہ تعالیٰ کی مرضی ومشیت ہی سے نازل ہوا۔[۱]

اس کے علاوہ بعض مواقع پر بعض سنگین مسائل پیش آئے جن کے حل کے لیے آپؐ کو وحی کا انتظار رہتا،مگر آپؐ کی خواہش کے مطابق وحی کا نزول فوراً نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس کے لیے بعض وقت مہینوں انتظار کی گھڑیاں گننی پڑتی تھیں۔بطور مثال واقعۂ اِفک کو پیش کیا جاسکتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پر الزام تراشی کی گئی جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی زوجۂ مطہرہ اور ان کے گھر والے سخت ذہنی اذیت میں مبتلا رہے،مگر اس بارے میں وحی کا نزول تقریباً ایک ماہ کے بعد اس وقت ہوا جب اللہ کی مشیت ہوئی۔اسی طرح ایک موقع پر بعض کفارِ مکہ نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے،آپؐ نے اگلے روز ان کا جواب دینے کا وعدہ کیا،مگر آئندہ پندرہ دنوں تک وحی نازل نہیں ہوئی اور آپؐ ان کا جواب دینے سے قاصر رہے، یہاں تک کہ سوال کرنے والے چہ می گوئیاں کرنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول ہوا اور کفار کے سوالات کے جوابات دیے گئے۔[۲] ایک بار نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل

---

[۱] دیکھیے بخاری، کتاب کیف کان بدء الوحی

[۲] دیکھیے سیرۃ النبی لابن ہشام ۱/ ۳۲۱

علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ میرے پاس کثرت سے آیا کیجیے اور اللہ کی آیات سنایا کیجیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّکَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِکَ وَمَا كَانَ رَبُّکَ نَسِيًّا. (مریم:۶۴)[1]

اے نبیؐ، ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

۴- وحی اور معجزہ

دیگر انبیاء ورسل کو وحی کے ساتھ بعض حسّی معجزات بھی دیے جاتے تھے جن کو وہ اپنی نبوت ورسالت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ لیکن خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی اسی کو معجزہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اس جیسا کلام انس وجن مل کر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو سابقہ قوموں کے مثل کفار مکہ نے بھی آپؐ سے معجزات کا مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسولؐ پر جو کلام نازل ہو رہا ہے وہ معجزہ ہے، یعنی اس جیسا کلام کوئی انسان پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اس کے وحیِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے، لہٰذا اگر تم نے اس کا انکار کیا تو عذاب نازل ہوگا۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا جَآءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ. (الانعام:۱۲۴)

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں ''ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے'' اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

مزید ملاحظہ کیجیے: الاسراء، آیت ۸۸-۹۶

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورہ مریم

۵-وحی کی محفوظیت

ماقبل انبیاء پر جو وحی نازل ہوئی وہ محفوظ نہ رہ سکی اور گردشِ دوراں کی نذر ہوگئی۔ اس کے برعکس حضرت محمد ﷺ پر جو وحی اتاری گئی اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے اتارنے والے نے لیا اور آج وہ پوری طرح ہمارے پاس موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (الحجر:۹) — ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

٦-قرآن کی تاثیر

نبی کریم ﷺ پر جو وحی اتر رہی تھی وہ دلوں کو مسخّر کر رہی تھی۔ ماننے والے بھی اس سے متاثر تھے اور نہ ماننے والے بھی اس کی تاثیر کی زد میں آ رہے تھے۔ کتبِ تاریخ و سیرت میں قرآن سے لوگوں کے متاثر ہونے کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ ایک واقعہ عتبہ بن ربیعہ کے حوالے سے مذکور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قریش کے بڑے بڑے سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور طے کیا کہ کسی کو محمد (ﷺ) سے بات کرنے کے لیے بھیجا جائے کہ اگر وہ مال و دولت کے خواہاں ہیں، یا کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں، یا ملک و ریاست کے طلب گار ہیں تو ہم انھیں یہ چیزیں دینے پر تیار ہیں، مگر وہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنا بند کر دیں۔ اس موقع سے عتبہ بن ربیعہ کو منتخب کیا گیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور گفتگو کی تو آپؐ نے سورۂ حم السجدہ کی چھ آیات سنائیں۔ اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مزید گفتگو نہ کر سکا اور خوف کے مارے واپس چلا گیا۔ اس نے روسائے قریش کو بتایا کہ محمدؐ کا کلام غیر معمولی کلام ہے۔[1] اسی طرح ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق کا وہ واقعہ مشہور ہے جس میں ان تینوں نے طے کیا کہ اب وہ محمدؐ کے گھر کے پاس آ کر آپؐ کے قرآن پڑھنے کو انہیں سنا کریں گے، مگر قرآن کی تاثیر یہ تھی کہ ان

---

[1] دیکھیے سیرۃ النبی لابن ہشام، ۱/۳۱۳-۳۱۴

میں سے ہر ایک چھپ کر آتا اور کلام اللہ سنتا تھا، یہاں تک انھوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ محمدؐ کے پاس وحی کا نزول ہوتا ہے جس کی تاثیر سے بچنا آسان نہیں ہے۔[۱] اسی طرح ابن الدغنہ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکر کو پناہ دی تھی، مگر ان کی تلاوت قرآن سے ان کے پڑوسی متاثر ہونے لگے جس پر ان کی شکایت کی گئی، چنانچہ ابن الدغنہ نے اپنی پناہ ختم کردی۔[۲] اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات تاریخ و سیرت کی کتابوں میں درج ہیں۔ اہل ایمان کے قرآن سے متاثر ہونے کی شہادت خود قرآن نے پیش کی ہے۔ ارشاد ہے:

اللَّـهُ نَـزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّـذِيْـنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ. (الزمر:۲۳)

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔

قرآن کی یہی اثر پذیری تھی کہ مختصر وقت میں نہ صرف پورا جزیرۂ عرب دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا، بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں کلمۂ توحید کی آواز بلند ہونے لگی۔

---

[۱] سیرۃ النبیؐ لابن ہشام، ۱/۲۳۸-۲۳۷

[۲] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبیؐ واصحابہ الی المدینۃ

حالی کی مذہبی فکر پر مغرب کا اثر
(حیات جاوید کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

مہدی افادی نے شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) کو اردو ادب کے عناصر خمسہ میں شمار کیا ہے۔ دوسرے چار بزرگ سرسید، نذیر احمد، شبلی اور محمد حسین آزاد ہیں۔ اگر اس فہرست سے آزاد کو خارج اور ذکاء اللہ کو شامل کر لیا جائے تو اس 'بنات النعش' میں سرسید کی حیثیت قطب اور بقیہ کی چار پایوں کی ہے۔ سرسید (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) اس دبستان ادب کے نہ صرف بزرگ ترین رکن تھے، بلکہ ان کی حیثیت امیر، رہ نما اور سرپرست کی تھی۔ انہوں نے اپنی جامع الصفات شخصیت کی وجہ سے ایک محور کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس کے گرد اس وقت مسلمانوں کی تقریباً تمام ہی سیاسی، سماجی، ادبی، علمی، تعلیمی اور مذہبی سرگرمیاں گردش کرتی تھیں۔ ان کی کوششوں ہی کا ثمرہ تھا کہ مسلم قوم میں تعلیمی، ثقافتی، سائنسی اور قومی شعور بیدار ہوا، جس کا ایک زندہ مظہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ سرسید کے حالات زندگی پر سب سے پہلے ان کی وفات سے تیرہ سال پہلے کرنل گریہم نے قلم اٹھایا تھا، لیکن اس وقت کے انگریزی اخبارات میں اس پر جو تبصرے شائع ہوئے ان میں اسے نامکمل قرار دیا گیا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کو سب سے پہلے سرسید کی سوانح حیات لکھنے کا خیال مدرسۃ العلوم کے سلسلہ میں ان کی کاوشوں اور تہذیب الاخلاق میں ان کے تعلیمی و اصلاحی مضامین کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ان کی تصنیف 'حیات جاوید' سرسید کی وفات کے بعد ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس ''حیات جاوید کا خاکہ ۱۸۷۱ء میں تیار ہوا اور تصنیف ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح تینتیس سال میں اس کا مواد تیار ہوا'' [۱]۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا یہ بھی خیال ہے کہ '' تنقید،

انشائیہ اور شاعری کے میدان میں بھی حالی کو وہ امتیازی کامیابی اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو سوانح نگاری میں ہوئی''۲۔ انہیں کا یہ بھی کہنا ہے کہ'' حالی نے سوانح کے مغربی تصور کے زیر اثر اسے تاریخ سے الگ کر کے ایک علٰحدہ اور آزاد فن اور ادبی صنف کا درجہ دیا''۳۔ان کے نزدیک'' سعدی، غالب اور سرسید تینوں اپنی صلاحیتوں اور قدروں کے اعتبار سے دراصل حالی ہی کی شخصیت کے تین رخ تھے .....ان تینوں کی سوانح لکھ کر گویا حالی نے خود اپنی سوانح عمری مکمل کی ہے''۴۔اس کے برخلاف محقق رشید حسن خاں کی رائے ہے کہ'' مولانا حالی محقق نہیں تھے۔وہ روایتوں کو اس طرح قبول کر لیا کرتے تھے جس سے غلط فہمی کے دروازے کھل سکتے ہیں''۵۔ سید عبداللہ کہتے ہیں 'حیات جاوید' سوانح کے توسیعی تصور کا ایک شاہ کار ہے''۶۔واضح رہے کہ حالی کے معاصر شبلی نے تحقیق اور استناد کی وہ روایت قائم کی جس نے بعد میں تحقیق کے لئے ایک شرط کا درجہ حاصل کیا۔

دبستان سرسید کے دوسرے سوانح نگار شبلی نعمانی ہیں۔ حالی اور شبلی دونوں کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا ہے۔اگر چہ شبلی عمر میں حالی سے بہت چھوٹے تھے، لیکن دونوں کی لکھی گئی سوانح عمریاں تقریباً ایک ہی زمانہ میں شائع ہوئیں۔علامہ شبلی کی 'حیات امام ابو حنیفہ' ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔'المامون' اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی اور 'الفاروق' کا مواد تیار تھا۔ حالی کی 'حیات سعدی' کا پہلا اڈیشن ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۷۔ اور 'یادگار غالب' کا پہلا اڈیشن ۱۸۹۷ء میں ۸۔اس طرح یہ دونوں بزرگ اپنی حیات کی طرح سوانح نگاری میں بھی ہم عصر تھے۔اس کے باوجود دونوں کے انداز تحقیق میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔شبلی کے نزدیک 'حیات جاوید' سرسید کی یک رخی تصویر ہے۔اس کا انداز تحریر مدلل مداحی ہے:''میں 'حیات جاوید' کو لائف نہیں بلکہ 'کتاب المناقب' سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل''۹۔لیکن مہدی افادی کے نزدیک ''حیات جاوید، ایک شریف انسان کے قلم سے ایک شریف تر انسان کی سرگزشت ہے''۱۰۔سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ 'حیات جاوید' کی شہرت کو شبلی کے قلم سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا حالی کے اس دیباچہ سے جو 'حیات جاوید' کے شروع میں ہے''۱۱۔ان سب کے باوجود سید عبداللہ اس بات

کے مؤید ہیں کہ ''اردو کا بہترین سوانح نگار ہونے کا فخر ابھی تک حالی کو حاصل ہے'' ۱۲۔

حالی کے تصنیف کردہ تین سوانحی تذکروں میں 'یادگار غالب' مختصر ترین ہے، جس میں کتاب کا بیش تر حصہ کلام غالب کی شرح ہے۔ 'حیات سعدی' کی ضخامت 'یادگار غالب' سے زیادہ ہے۔ اس میں بھی سوانح کا حصہ بہت کم اور زیادہ حصہ تنقیدی ہے۔ لیکن 'حیات جاوید' کو اردو زبان کی طویل ترین سوانح میں شمار کیا جا سکتا ہے، جب کہ حالی اسے مختصر بھی کر سکتے تھے لیکن ع۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم، کے تحت اس کا پہلا اڈیشن گیارہ سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل تھا۔ مقالہ نگار کے پیش نظر کتاب کا جو نسخہ ہے وہ 'ترقی اردو بورڈ' کا ۱۹۷۹ء کا شائع کردہ ایڈیشن ہے جس میں متن کتاب کی ضخامت بڑی تقطیع کے ۸۷۵ صفحات اور بعد ازاں ضمیمہ جات اور قاموس الاعلام (انڈکس) تا ۹۸۴ صفحات ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کا پڑھنا آسان نہیں ہے، اس لیے 'انجمن ترقی اردو' نے اس کی ایک تلخیص شائع کی ہے جو بہار الہ آبادی کی محنت کی مرہون منت ہے۔ یہ تلخیص بھی کتابی سائز کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کی پیش کش انتہائی ناقص ہے۔ 'ترقی اردو بورڈ' کی شائع کردہ اصل کتاب اگر چہ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بہتر ہے لیکن اس کا کاغذ خستہ ہے۔

مقالہ کے عنوان کا اقتضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی وضاحت کی جائے کہ 'مغرب کے اثرات' سے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے؟ 'مغرب کے اثرات' سے مراد ہے اقدارِ زندگی میں وہ ثقافتی، تہذیبی، مذہبی اور سیاسی فکر اپنانا جو مشرق کی اور خصوصاً مسلم اقدار اور فکر کی نفی کرتی ہوں۔ اس میں مغرب کے علمی افادات اور سائنسی ترقی و انکشافات سے فائدہ اٹھانا شامل نہیں ہے، جیسا کہ حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں مغربی انداز نقد کو اپنے اصول تنقید میں جگہ دی ہے اور بہت سے مغربی نقاد اور شعراء کی فکر سے استناد کیا ہے۔ مغرب سے استفادہ کرتے ہوئے حالی اور محمد حسین آزاد نے نظم کی صنف کو اردو زبان میں متعارف کرایا اور خود بہت سی مفید نظمیں لکھیں۔ ثابت شدہ سائنسی حقائق کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کرنا بھی اس زمرے میں نہیں آتا۔ علامہ طنطاوی

جوہری کی ضخیم 'تفسیر جواہر' اس کی واضح مثال ہے۔ کیونکہ علم اور سائنس کسی کی ذاتی جائداد نہیں ہیں ۔البتہ بلا وجہ انگریزی الفاظ کا بے دریغ استعمال، جب کہ اردو زبان میں ان کے مترادفات اور ہم معنی الفاظ موجود اور مروج ہیں، مغرب سے اثر پذیری میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر حالؔی نے اپنی نثر میں بے شمار انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ہم ذیل میں کچھ الفاظ اور ان کے اردو مترادفات دے رہے ہیں۔ اس سے ہماری بات کی وضاحت ہو سکے گی۔

سلف رسپکٹ (خودداری)، کریٹیکل (تنقیدی)، پالٹکس (سیاست)، فزیکل قابلیت (جسمانی صحت)، ماٹو (مقصد)، ہسٹری (تاریخ)، سوشل اور مورل (سماجی اور اخلاقی)، ڈسپاٹک گورنمنٹ (آمرانہ حکومت)، فونڈیشن اسٹون (سنگ بنیاد)، اسپیچ (تقریر)، لبرٹی (آزادی یا حریت)، میوٹنی (غدر)، ریپریزنٹیٹیو اصول (نمائندہ اصول)، مجارٹی (اکثریت)، ایسّے essay (مضمون یا مقالہ)، ریفارمیشن (اصلاح) پروفٹ (پیغمبر) وغیرہ۔ ایسے بے شمار الفاظ ہیں جنہیں حالی نے بلاضرورت اپنی کتابوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے نہ صرف حسن کلام متاثر ہوا ہے، بلکہ انگریزی زبان سے ان کی مرعوبیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مولانا حالؔی کے نزدیک سرسید کی قوت عمل کا محرک مذہب تھا، کیونکہ ان کا تعلق شاہ غلام علی کی خانقاہ اور شاہ عبدالعزیز اور مولوی محمد اسماعیل کی علمی مجالس دونوں سے تھا[۱۵]۔ فقہی مسلک میں وہ غیر مقلد یعنی مولانا اسمٰعیل کے مسلک کے پابند تھے۔ اگرچہ یہ بات 'حیات جاوید' میں نہیں ہے، لیکن با وثوق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے ذکر کردہ اساتذہ کے علاوہ سرسید نے مولانا مملوک علی سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی مولانا مملوک علی کے شاگردوں میں تھے۔ اسی لیے سرسید نے مدرسۃ العلوم کے شعبۂ دینیات کو ان کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کے سپرد کیا تھا اور انہیں 'شیخ الاسلام' کا خطاب دیا تھا۔

حالی اور سرسید 'نیچر' کا بہت وظیفہ پڑھتے ہیں۔ رفقائے سرسید میں شبلی واحد

آدمی ہیں جو افکار مغرب سے مرعوب نہیں ہوئے، لیکن حدیث کے مسئلہ میں 'درایت' کی انھوں نے جو تعریف فرمائی ہے اس میں انہوں نے بھی اقتضائے طبیعت (nature) کے مطابق ہونے کو حدیث کی صحت کی شرط قرار دیا ہے۔[۱۳]

سرسید کی پوری زندگی مسلمانوں کی خیر خواہی اور اسلام کے دفاع میں گزری۔ ان کے بعض خیالات اور خصوصاً قرآن کی تفسیر اور بعض احکام کی تاویل صرف علماء نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی اجنبی تھے۔ علمائے کرام نے اس معاملہ میں ان سے معارضے کئے۔ ان کے خلاف محاذ بھی قائم ہوئے، لیکن سرسید اپنی تاویلات میں ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ سرسید کے رفقاء میں بھی اکثر حضرات ان کے تجدد کے شاکی رہے، لیکن یہ اختلاف (یا شکایت) سرسید کے قومی کاموں میں ان کے ساتھ تعاون میں مانع نہیں ہوا۔

مطالعہ اور تجرباتِ زندگی نے سرسید کی فکر کی جو تربیت کی اس میں تعقل اور تفکیر نے اپنی جڑ مضبوطی سے جمالی۔ وہ تقلید کے زبردست مخالف تھے۔ ان کی تمام تحریریں ان کے اپنے ذہن کی اپج ہیں۔ اپنے وقت کے مدارس میں زیر درس ساری کتابیں وہ پڑھ چکے تھے۔ ان کے متون سے انہوں نے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا۔ اپنی اس محنت سے وہ جس نتیجہ پر پہنچے وہ حالی کی زبان میں ''ان کی تلاش وجستجوئے حق کا نتیجہ **الاسلام ھو الفطرۃ والفطرۃ ھو الاسلام** تھا۔[۱۴]

معاشرتی اور تعلیمی اصلاح تو ان کا مشن ہی تھا، لیکن اسلام پر دوسرے مذاہب خصوصاً عیسائیوں کے حملوں کے جواب میں انہوں نے کتابیں لکھیں۔ حالی نے سرسید کی مذہبی خدمات کا نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کی یہ تحریر 'حیات جاوید' کے صفحہ ۴۱۳ سے صفحہ ۵۷۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے بطور تمہید یہ بتلایا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان تین طرح کے خطرات میں مبتلا تھے۔ پہلا خطرہ عیسائیوں کی طرف سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مسخ کرنا تھا۔ اس ذیل میں مولانا حالی نے بجا طور سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولوی آل حسن اور اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ کے دفاعی مناظروں کی افادیت کا اعتراف کیا ہے[۱۵]۔ لیکن حالی جیسے عالم دین کے قلم سے

پیغمبر اسلام کے لیے' بانیٔ اسلام' کے لفظ کا استعمال حیرت ناک ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حالی بھی سرسید کی طرح اہل مغرب کی اس فکر سے متأثر تھے کہ حضرت محمد ﷺ اسلام کے بانی ہیں۔ حالی کے نزدیک دوسرا خطرہ سیاسی اسباب سے تھا۔ چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ خصوصیت سے مسلمانوں کے درپے آزار تھے۔ تیسرا خطرہ ان کے نزدیک مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزی کے بجائے عربی و فارسی ہی میں تعلیم ملنی چاہئے، لیکن بعد میں وہ بھی قائل ہوگئے تھے کہ ان کے لئے انگریزی تعلیم بھی ضروری ہے، ورنہ دنیوی ترقی میں وہ ابنائے وطن سے پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ سوانح ہمیں بتاتی ہے کہ سرسید نے ان تینوں خطروں کا مقابلہ کیا۔ سرسید کے سیاسی افکار پر علٰحدہ گفتگو کی گئی ہے۔[۱۶] ان کے مذہبی تفردات کی فہرست کافی طویل ہے لیکن مقالہ کے محدود عنوان کے تحت یہاں ان کے صرف چند ہی تفردات کا ذکر کیا جائے گا جن میں انہوں نے مسلمانوں کی متفقہ اور مسلمہ فکر سے اختلاف کیا ہے اور جس کا سبب مغرب سے مرعوبیت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حالی کا کردار اس سلسلہ میں یہ ہے کہ انہوں نے سرسید کے خیالات پر صرف مثبت انداز میں گفتگو کی ہے اور اکثر جگہ اس کی تصویب میں دلائل پیش کیے ہیں۔

جس طرح سرسید انگریزوں سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی خاطر سینہ سپر رہے ویسے ہی عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر ہونے والے حملے کے دفاع میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ لیکن ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں قربت اور مؤدت پیدا کی جائے، کیونکہ قرآن کے بیان کے مطابق یہودیوں کے مقابلہ میں نصاریٰ زیادہ نرم خو ہیں (المائدہ: ۸۲)۔ اس بات کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے 'تبیین الکلام' تصنیف فرمائی۔ اس کا مقصد قرآن اور بائبل میں مطابقت ثابت کرنا تھا۔ یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکی ہے۔[۱۷] اس لیے اس کے مندرجات کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ مولانا حالی نے اس کتاب کا جتنا تعارف کرایا ہے اس سے یہ بات تو معلوم ہوتی ہے کہ نسخ اور تحریف لفظی کے معاملہ میں سرسید تمام علمائے سابقین کی آراء کے خلاف تھے۔ اتنا ہی

نہیں بلکہ بائبل کی تحریف کا قائل نہ ہونا تو سراسر خلاف قرآن تھا (البقرہ :۷۹)۔ حالی نے خود اس کے برخلاف عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث، کفارہ اور خاتم النبین ﷺ کے انکار کی بنا پر عیسویت کو اسلام کے مغائر قرار دیا ہے[۱۸]۔ لیکن بہر حال سرسید اپنی نیت اور جذبہ میں صادق تھے۔

سرسید سر ولیم میور کی 'لائف آف محمدؐ' کو پیغمبر اسلامؐ کے کردار پر زبردست حملہ تصور کرتے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ مسلمانوں میں کوئی اس کتاب کا جواب لکھنے کا اہل نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے خود اس کا جواب لکھا جو خطبات احمدیہ کے نام سے انگلستان میں شائع ہوا۔ سرسید نے اس کے مواد کے حصول کے لئے اپنی کوٹھی اور کتب خانہ بیچ کر لندن کا سفر کیا اور کتاب وہیں لکھی۔ حالی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کا امتیازی وصف یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا اسلوب نہ مناظراتی اور جدلیاتی ہے نہ الزامی کہ جو مخاطب کو صرف خاموش کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا Approach ہر شخص کے لیے معقول اور اطمینان بخش ہے۔ انہوں نے کثرت ازدواج اور طلاق کے مسئلہ میں احکام اسلامی کا دفاع کیا ہے۔ سرسید نے سر ولیم میور کے اس اعتراض کا بھی شافی جواب دیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اسلام کا بائبل میں مذکور جنگ اور غارت گری سے تقابل کیا ہے۔ کتاب میں بارہ خطبے ہیں اور سرسید نے تمام خطبوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سرسید کی کتاب 'تبیین الکلام' کی تو دوسرے علماء کی طرف سے مخالفت ہوئی لیکن 'خطبات احمدیہ' پر کسی اختلاف کا حالی نے ذکر نہیں کیا ہے۔

سرسید کی تفسیر ہمارے سامنے نہیں ہے، لیکن مولانا حالی نے اس کے اکتالیس نکات کی نشان دہی کی ہے جو جمہور امت کی آراء کے خلاف ہیں۔ حالی نے جگہ جگہ تفسیر بالرائے کے حق میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''سرسید کے مذہبی استدلالات جو اس وقت مقبول نہیں ہوئے، وقت آنے کے ساتھ ساتھ انہیں قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا جائے گا''[۱۹]۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''اس وقت تمام دنیا میں

مذہب کی صداقت کا معیار یہ قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصول تمدن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا'' ۲۰۔ سرسید کے تفسح اسرار قرآنی پر حالی یوں رطب اللسان ہیں: ''سرسید کی تلاش وجستجوئے حق کا نتیجہ **الاسلام ھو الفطرۃ و الفطرۃ ھو الاسلام** تھا'' ۲۱۔ سرسید کے قابل اعتراض افکار پر جو علمی اعتراضات ہوئے حالی انہیں فقط ایک آزمائش قرار دیتے ہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش فرماتے ہیں **اَفَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا ءَامَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُونَ** (العنکبوت:۱) ''کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کے صرف اس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے ہیں ہم انہیں بغیر آزمائے ہوئے ہی چھوڑ دیں گے''۔ حالی سرسید کی اصابت فکر کے ثبوت میں ارشاد فرماتے ہیں'' **الدین النصیحۃ**'' یعنی دین خیر خواہی کا نام ہے۔ اس کے لیے تقدس کی نہیں بلکہ راست بازی کی ضرورت ہے۔ **انظر الی ما قال و لا تنظر الی من قال** ۲۲ (یہ دیکھو کہ کیا کہا، یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا)۔ حالی نے 'حیات جاوید' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ: ''سرسید نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی'' ۲۳۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلامی لٹریچر میں اختلاف آراء وافکار کی وجہ سے تو اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اللہ کا قانون ہے: **بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (الانبیاء:۱۸) ''مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے''۔ حالی نے اسلامی تاریخ کے علمی و کلامی اختلافات کو سرسید کے تفردات کی حمایت میں پیش فرمایا ہے۔ حالاں کہ قدمائے اسلام کے فکری تفردات، خواہ وہ عقائد سے متعلق رہے ہوں یا علم کلام کے اور مباحث سے، ایک یا چند مسائل میں تھے، نہ کہ جملہ مسائل میں۔ انہوں افکار باطلہ کا کوئی جال نہیں بنا تھا۔ معتزلہ صرف احادیث صفات کا انکار کرتے تھے۔ احادیث کی مطلق حجیت کا انہیں اعتراف تھا۔ معتزلہ اور متکلمین کے ساتھ متأخرین فقہاء کی ایک مختصر جماعت نے صرف خبر واحد کو حجت ماننے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن سرسید نے قبول احادیث میں صرف ایک اصول قائم کیا کہ اسے نیچر کے خلاف نہ ہونا چاہئے۔ نیچر کا کلمہ وہ اتنی بار

دہراتے ہیں کہ یہ ان کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ حالی بھی پوری کتاب میں نیچر ہی کے گن گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ احادیث متواترہ کی حجیت پر تمام امت کا اجماع ہے، لیکن حالی لکھتے ہیں: ''اس زمانہ میں تواتر کو اس حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جس کی روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانون قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو'' ۲۴۔ اسی لیے سرسید معجزوں کی یا تو تاویل کرتے ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ: ''معجزوں کا دلیل نبوت ہونا اور بات ہے، لیکن معجزات کا صدور اور بات ہے'' ۲۵۔ ان کا کہنا ہے کہ قوانین قدرت کبھی نہیں بدلتے، جیسا کہ قرآن میں مختلف مقامات پر ارشاد ہوا ہے، مثلاً سورۂ قمر میں ہے اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاہُ بِقَدَرٍ (القمر ۴۹) ''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے''۔ ایسی ہی آیات سورۂ رعد، فرقان، روم، فتح اور بنی اسرائیل میں ہیں۔ یہ حضرات اللہ کی قدرت کاملہ کو، جو کائنات کی فطرت میں تصرف کرنے پر قادر ہے، نہایت سہولت سے فراموش کر جاتے ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۵۹ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو مار کر سو سال بعد دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس مدت میں اس کا کھانا تر و تازہ موجود تھا، لیکن گدھے کی ہڈیوں سے دوبارہ اسے کھڑا کر دیا گیا، یا اصحاب کہف کا واقعہ جو سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں میں ہے، یا مچھلی کے زندہ ہو کر سمندر میں چلے جانے کا واقعہ، جس کا ذکر سورہ کہف کی آیت نمبر ۶۱ میں ہے، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر آسمان سے مائدہ نازل ہونے اور ان سے باذن الٰہی متعدد معجزات کے صادر ہونے کا بیان، جن کا ذکر سورہ مائدہ کی آیات نمبر ۱۱۴، اور ۱۱۰ میں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت سے معجزات کا ذکر تو بائبل میں بھی ہے لیکن 'نیچر' کے اس وظیفہ نے ان بزرگوں کی مغرب نوازی کو بھی مات دے دی ہے۔

حالی نے 'حیات جاوید' کے آخر میں صفحہ ۸۵۶ تا ۸۷۵، اپنا ایک طویل مقالہ نقل کیا ہے جو دسمبر ۱۸۹۹ء کے ماہ نامہ 'معارف' اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں انھوں نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے کہ قرآن میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟ سرسید آیات متشابہات پر ایمان لانے کے لیے بھی ان کا فہم ضروری سمجھتے

تھے ۲۶۔ آیات متشابہات کا ذکر قرآن میں اس طرح ہے:

هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ. فَأَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِیلِهِ . وَ مَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهُ اِلَّا اللّٰهُ . وَ الرّٰسِخُونَ فِی الْعِلْمِ یَقُولُونَ اٰمَنَّا بِهِ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا . وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ

(آل عمران: ۷)

وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس میں محکم آیات ہیں جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور ان کی اصل حقیقت معلوم کریں، حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے ہی رب کی طرف سے ہیں۔ اور یاددہانی تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت کی رو سے متشابہات کا علم اہل ایمان کے لیے ضروری ہی نہیں ہے، اس لئے سرسید کا یہ اصرار فہم سے بالا تر ہے۔ آیات متشابہات کے معنیٰ و مفہوم میں اسلاف میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے، اس لیے حالی نے محکمات اور متشابہات پر جو گفتگو فرمائی ہے اس میں علمائے سلف کے ان اختلافات کا ذکر کیا ہے جو ان آیات کی تشریح میں وارد ہیں ۲۷۔

سرسید حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ نزول کو غلط روایات پر محمول کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف اس کے بارے متعدد صحیح روایات موجود ہیں، بلکہ قرآن میں بھی اس کے اشارے پائے جاتے ہیں ۲۸۔ اور یہ امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسیح موعود کے دوبارہ آنے کے منتظر نہ صرف مسلمان ہیں، بلکہ یہودی اور عیسائی بھی ہیں ۲۹ جو مسلمانوں کے ساتھ ایک محاربہ عظیم (Armageddon) کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۳۰۔

حالی نے سرسید کی دینی خدمات کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے: ''نہ وہ واعظ تھا نہ مفتی، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی۔ باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کا حل

کرنے والا تمام ہندوستان میں یہی ایک شخص تھا''[۳۱]۔مزید فرماتے ہیں کہ:''سرسید کے تمام اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشککین کے شبہات کا رفع کرنا تھا''[۳۲]۔حالی نے 'تفسیر احمدی' کی تحسین کرتے ہوئے سرسید کی بیس اولیات کا ذکر فرمایا ہے جن پر ان کے خیال کے مطابق پہلے کسی مفسر نے گفتگو نہیں فرمائی ہے[۳۳]۔مزید فرماتے ہیں کہ 'حالی کے نزدیک تفسیر القرآن، جس میں گویا نئے علم کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے، سب سے عمدہ نمونہ ان کی تصنیفات کا ہے۔اس کا اندازہ اس سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے بخوبی ہوسکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لئے اختیار کیا گیا ہے''۔[۳۴] سرسید کی زندگی ہی میں مولانا عبدالحق حقانی نے 'تفسیر احمدی' کی رد میں 'تفسیر حقانی' تصنیف فرمائی جو عوام میں بے انتہا مقبول ہوئی اور آج تک اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری ہے۔سرسید کے کلامی مباحث کے جواب میں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ نے 'تفسیر ثنائی' لکھی۔یہ تفسیر بھی کئی بار شائع ہوچکی ہے اور مسلمانوں کے ایک طبقہ میں بہت مقبول ہے۔

تفسیر سرسید کی حمایت میں حالی کی اس مفصل تحسین وتوصیف سے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ حالی و سرسید کے زمانہ میں سائنس نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اگر قرآن کی جدید تفسیر نہ کی جاتی تو شاید جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا قرآن پر سے اعتماد اٹھ جاتا۔یہ در اصل دبستان سرسید کی مغرب سے بے انتہا مرعوبیت کی دلیل ہے۔یہ غلط فہمی اس لیے لاحق ہوئی کہ سرسید کا غالباً یہ گمان تھا کہ ان کے زمانہ میں علم وحکمت اس قدر عام ہے کہ دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اس سے واقف ہوگیا ہے۔لیکن یہ غلط خیال اور مہمل بات ہے۔سائنسی انکشافات کی جو رفتار پہلے تھی اب اس سے کئی گنا بڑھ گئی ہے اور سائنس دانوں کے لئے یہ بات حیران کن ہے کہ جو باتیں انہیں آج معلوم ہو رہی ہیں انہیں قرآن میں چودہ سو سال پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔چنانچہ بہت سے لوگ اب قرآن کے بیان کردہ سائنسی حقائق کی بنا پر ایمان لائے ہیں۔

سرسید کی تفسیر کو ایک صدی گزر چکی ہے۔علم وتحقیق اور ایجادات وانکشافات کا

قافلہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ سائنس کی مزید ترقی کے ساتھ قرآن کے یہ حقائق مزید مبرہن ہوئے ہیں، لیکن مغیبات کا انکار کہیں نہیں ہوا ہے، کیونکہ اس بات کا یقین تو سائنس دانوں کو بھی ہے کہ علم کل کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حالی کے متصلاً بعد کا پچاس سالہ دور اسی عقلی برتری کے زعم میں مبتلا تھا۔ پندار کے اس بت کو بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں بہت سے علمائے کرام نے پاش پاش کر دیا تھا۔ ان میں سرفہرست مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں جنہیں مولانا عبدالماجد دریابادی نے بجا طور سے متکلم اسلام کا خطاب دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک مختصر مجموعۂ مضامین 'تنقیحات' بہت مقبول ہوا ہے۔ اس سے بہت سے متجددین کے عقائد کی اصلاح ہوئی ہے۔

اگر حالی 'حیات جاوید' کے ضمیمہ میں اپنا 'معارف' میں شائع شدہ مقالہ جو تاریخ اور اصول تفسیر پر مشتمل ہے نہ شامل کرتے تو بھی 'تفسیر احمدی' کے ذیل میں انھوں نے سرسید کی جس طرح مدح سرائی کی ہے وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ سرسید کی فکری بے اعتدالیوں کے بہت بڑے مؤید ہیں۔ اس مقالہ نے تو ان کی سرسید کی فکر کی تائید پر مہر ثبت کر دی ہے۔

یہاں سرسید کی چند فکری لغزشوں پر قرآن ہی کے روشنی میں مختصر سی گفتگو کی جارہی ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ سرسید اور ان کا پورا طائفہ مغرب کے علوم وفنون کے علاوہ ان کی مذہبی فکر سے، جو سراسر اسلامی احکام وعقائد کے خلاف تھی، بری طرح متأثر ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اگر احادیث آڑے آئیں تو انہوں نے ان کی حجیت کا انکار کر دیا اور آیات قرآنی کی وہ تاویل کی جس نے حیرت ناک حد تک خدا و جبرئیل اور وحی ورسالت کے عقیدہ ہی کو بدل کر رکھ دیا۔

۱- سب سے پہلے ہم ذبیحۂ اہل کتاب کے مسئلہ کو لیتے ہیں جس میں طیور منخنقہ کی مطلق حلت ثابت کی گئی ہے۔ اس مسئلہ پر سرسید نے الگ سے ایک رسالہ قلم بند کیا ہے اور حالی نے اس کا ذکر بڑے تحسینی اور تصویبی انداز میں بار بار کیا ہے۔ سرسید کا خیال ہے کہ جس طرح اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لیے حلال ہیں ویسے ہی ان کا

ذبیحہ بھی حلال ہے۔ان کا استدلال قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ہے:

اَلْیَومَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَ طَعَا مُ الَّذِینَ اُوتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَکُمْ وَ طَعَا مُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ. (المائدہ:۵)

آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں۔اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے۔

اس آیت میں اہل کتاب کے عام کھانے کا ذکر ہے،ذبیحہ کا ذکر قطعاً نہیں ہے، اس لیے اس آیت سے موجودہ عیسائیوں کے غیر مذبوح ذبیحہ کے جواز پر استدلال سخت مغالطہ اور تاریخی اور مذہبی حقائق کا انکار کرنا ہے۔اس سے اصول تفسیر کی پامالی ہوتی ہے:

۱] تفسیر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ القرآن یفسّر بعضہ بعضا یعنی قرآن کے کسی مجمل یا غیر واضح حکم کی تشریح قرآن ہی میں دوسرے مقامات پر مل جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پورے قرآن پر نظر ہونا ضروری ہے۔

۲] اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک نبیؐ کے اوپر نازل کیا جو اس کی تشریح و توضیح کرتا اور اس کے اسرار سے لوگوں کو واقف کراتا ہے،جیسا کہ ارشاد ہے:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُونَ (النحل:۴۴)

''اور یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں،شاید کہ وہ غور و فکر کریں''۔

سرسید اور حالی دونوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کی ہر آیت ایک مطلق حکم ہے۔یہی سبب ہے کہ سرسید نسخ کے بھی قائل نہیں۔یہ دونوں اصول،جن پر سرسید اور حالی کی تفسیر کی بنیاد ہے،باہم متعارض (Parodoxical) ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حیوانی ماکولات کو (باستثنائے چند) تین شرائط سے مقید کردیا ہے:

(۱) تذکیہ یا اہراق دم یعنی خون بہانا۔کیونکہ اللہ نے خون کو مطلق حرام کردیا ہے۔یہ حکم قرآن میں چار جگہ آیا ہے (البقرۃ:۱۷۳،المائدۃ:۳،الانعام:۱۴۵،النحل:۱۱۵)۔

(۲) ذبح سے پہلے اللہ کا نام لینا۔اس کا ذکر بھی قرآن میں کئی جگہ ہے (المائدۃ:۴)۔

(۳) صرف حلال چوپایوں کا ذبیحہ کرنا (المائدۃ:۱-۳)۔

لطف یہ ہے کہ یہودیوں کے یہاں بھی ذبیحہ کے لئے یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہیں ۳۵۔ اسی لیے یہودیوں کا ذبیحہ آج بھی مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کے حکم کو باقی رکھا تھا ۳۶، لیکن سینٹ پال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری شریعت ہی منسوخ کر دی ۳۷۔ یہاں تک کہ خنزیر ہی نہیں بلکہ تمام ممنوع ماکولات کو اس نے حلال کر دیا۔

مذکورہ تینوں شرائط ذبح کی روشنی میں جب ہم سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۵، جس میں اہل کتاب کے طعام کی حلت بیان کی گئی ہے، پر غور کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل دو نتائج سامنے آتے ہیں۔ یا تو طعام اہل کتاب کے معاملہ میں نصاریٰ کے لیے اس آیت میں تخصیص مانی جائے یعنی ان کے صرف ماکولاتِ غیر حیوانی حلال ہیں، یا یہ مانا جائے کہ عہد نبوی میں نصاریٰ کے جس گروہ کے مسلمانوں کا سابقہ تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق توریت کی شریعت پر عامل تھا ۳۸۔ آج بھی عیسائیوں کا ایک فرقہ موحدین (Unitarian) موجود ہے جو الوہیت مسیح، تثلیث اور کفارہ کا قائل نہیں ہے۔ یہ تو سینٹ پال تھا جس نے عیسائیت سے شریعت کو ختم کر دیا تھا ۳۹ تاکہ دین آسان ہو جائے اور لوگوں کو اس مذہب کی طرف رغبت پیدا ہو۔ ماکولاتِ حیوانی کی حلت کی یہ تینوں شرطیں موجودہ عیسائیت میں پوری نہیں ہوتیں، اس لیے سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۵ سے گردن مروڑی ہوئی مرغی کے جواز کی دلیل لانا بالکل غلط ہے۔ حالی نے طیور منخنقہ کی حلت میں ترکی کے علماء کے مثبت عمل کو پیش کیا ہے۔ اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص احادیث رسولؐ سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف قرآن کو دلیل کے طور پر پیش کرنے ہی کو صواب سمجھے اس کے لیے کسی کے مبینہ غلط طرز عمل سے دلیل لانا بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

اس ذیل میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ 'منخنقہ' کو اللہ تعالیٰ نے 'میتۃ' ہی کی تشریح میں پیش فرمایا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَ مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ ، وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيحَةُ وَ مَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ أَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ، ذَالِكُمْ فِسْقٌ (المائدہ:۳)

''تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو کسی ضرب سے مر گیا ہو اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو اور جو کسی کے سینگ مارنے سے مرا ہو اور جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو لیکن تم اسے ذبح کر ڈالو تو حرام نہیں، اور جو آستانوں پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ بھی کہ قرعہ کے تیروں کے ذریعہ فال گیری کرو، یہ سب بدترین گناہ ہیں''۔

اس آیت کریمہ میں منخنقہ کو علی الاطلاق حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے طیور منخنقہ کی حلت کسی بھی طور درست نہیں ہوسکتی۔ اگر اسے درست مانا جائے تو پھر خنزیر کو بھی لازماً حلال قرار دینا پڑے گا کیونکہ آج کل کے عیسائی خنزیر کا گوشت بھی بطیّب خاطر استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ 'نسخ آیات' اصول تفسیر کا ایک متفقہ مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں مفسرین کے کئی گروہ ہیں، اور نسخ کی تعداد ہر ایک کے نزدیک زیادہ یا کم ہے۔ لیکن اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اختلاف کی تعداد بہت محدود ہوجاتی ہے۔ مثلاً وصیت کا حکم، جو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۰ میں ہے، سورۂ نساء کی آیات وراثت سے منسوخ ہوجاتا ہے۔ یا جیسے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ میں ہے کہ اپنی کل فاضل رقم اللہ کی راہ میں دے دو، یہ حکم زکوٰۃ کی فرضیت کی وجہ سے منسوخ ہوگیا ہے۔ اس بارے میں علمائے تفسیر نے نسخ کے معنی یہ لیے ہیں کہ اگر ہنگامی حالات کبھی متقاضی ہوں تو ان پر عمل ہوسکتا ہے، جیسے یتیم پوتے کی وراثت کے لیے وصیت یا بعض غریب اور مسکین (indigent) اعزہ کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت۔ ہنگامی حالت میں جب کہ اسلامی حکومت کی بقا کی جنگ لڑی جارہی ہو تو انفرادی جائداد کی حیثیت ختم ہوجائے گی۔

آیات نسخ کی کثیر تعداد دراصل **تعمیم خاص** یا **تقیید مطلق** کے ذیل

میں آتی ہے جو اصلاً نسخ نہیں ہیں، لیکن بعض علماء نے انہیں نسخ میں شمار کیا ہے، جیسے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۳ میں دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع کرنے سے منع کیا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس حکم خاص کو وسعت دیتے ہوئے خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے سے منع کر دیا [۴۰]۔ یا جیسے سورۂ کوثر میں کہا گیا کہ نماز پڑھو اور قربانی کرو، تو قربانی کے اس مطلق حکم کو یوم النحر کی قربانی سے مقید کر دیا گیا۔ اس نسخ کی بے شمار مثالیں قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ آیات نسخ کی تعداد میں اضافہ کا خاص سبب یہی ہے، ورنہ منسوخات کی اصل تعداد بہت ہی کم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (البقرہ:۱۰۶) ''جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں''۔ اس سے قرآن کے مقصد نسخ کی اچھی توضیح ہوتی ہے۔ (مولانا شمس پیرزادہ نے آیت کا ترجمہ حکم کیا ہے، اس سے مقصد کی اور وضاحت ہو جاتی ہے)۔ یہ نسخ قرآن کی آیتوں سے بھی ہوتا ہے اور احادیث صحیحہ سے بھی۔ اس لیے سرسید اور ان کے طائفہ کا نسخ آیات سے مطلق انکار سراسر نص قرآنی کے خلاف ہے۔

مزید ستم یہ ہے کہ سرسید نے مغربی آقاؤں کی (اللہ سوئے ظن سے معاف فرمائے) خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پوری بائبل کو محکم قرار دیا ہے۔ ان کی کتاب 'تبیین الکلام' میں غالباً یہی بحث ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں شاہ پرست شاہ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ عیسائی علماء بائبل کو منزل بالوحی نہیں بلکہ منزل بالالہام مانتے ہیں، اور یہ الہام لفظی نہیں بلکہ معنوی ہے، جب کہ سرسید نے بائبل کے الفاظ کے محکم ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ قرآن نے سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت نمبر ۱۰۶ میں ''أو نُنْسِهَا'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے اگر اس کا مرجع بائبل کو مان لیا جائے تو اس آیت کی بہترین تشریح ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اہل کتاب کی الہامی کتابوں میں تحریف کی صراحت کی ہے:

" فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ، فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ

(البقرہ:۷۹) ''ان لوگوں کے لئے 'ویل' ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دیتے ہیں اور اس طرح دنیا کماتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمائی کو ویل 'ہلاکت' اور افسوس ہے''۔

بائبل کو پڑھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ موجودہ بائبل (عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں) میں اللہ کا کلام بھی ہے، رسول کی گفتگو بھی ہے اور تاریخ بھی ہے۔ اس طرح موجودہ کتاب بائبل کو کسی طور سے منزل من اللہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے سرسید کی یہ کوشش عیسائیوں اور مسلمانوں کو مخلصانہ طور سے ایک کرنے کی کوشش تو ہو سکتی ہے، لیکن اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ قرآن اس فکر کی پوری قوت سے تردید کرتا ہے۔

۳۔ جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے، سرسید نزول مسیح کے قائل نہیں ہیں۔ نزول مسیح کے بارے میں قرآن ناطق ہے۔ سورۂ نساء کی آیات ۱۵۷ تا ۱۵۹ ملاحظہ ہوں۔ ان میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعووں کے برخلاف صاف طور پر کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ مقتول ہوئے نہ مصلوب، بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔ اللہ نے انہیں (اوپر) اٹھا لیا۔ ان (حضرت عیسیٰؑ) کی موت سے قبل تمام اہل کتاب ان کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ رفع کے بعد جب تک دوبارہ نزول نہ ہو ان پر ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سرسید نے ظہور مہدی کی روایات کا انکار کیا ہے۔ اگرچہ علمائے اسلام میں سے بھی بہت سے لوگ ظہور مہدی کی روایات کو ضعیف سمجھتے ہیں، لیکن ایک طبقہ ان کو مشہور و متواتر سمجھتا ہے [۴۱]۔ لیکن نزول عیسیٰؑ کی روایات تو اس کثرت سے ہیں کہ انہیں تواتر کا درجہ دیا جا سکتا ہے [۴۲]۔

نزول مسیح کے منتظر یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں ہیں، لیکن تینوں کے نزدیک نظریات اور مقصد نزول میں فرق ہے۔ یہودی اور عیسائی ان کی آمد کے اس لیے چشم براہ ہیں اور اس کے استقبال کے لیے اقوام متحدہ کے ذریعہ فلسطین میں ایک نام نہاد مملکت اسرائیل کے نام سے قائم کر دی گئی ہے تا کہ ان کا مسیح موعود، کوہ صہیون

(mount Zion) پر واقع 'تختِ داؤد' پر رونق افروز ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے اس مسیح کاذب کو دجال (اکبر) کا نام دیا ہے اور نمازوں میں اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۴۳۔

۴۔ **معجزات اور خرق عادات** کے بارے میں سرسید اور حالی کی آراء ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ معجزات کا بیان توبائبل میں بھی ہے۴۴۔ اور عیسائی حضرات تو حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی وجہ سے انہیں خدا تک کہنے لگے ہیں۔ اب یہ موضوع زیادہ تفصیل کامحتاج نہیں رہ گیا ہے کیونکہ اس کا تعلق پیغمبروں کی روحانی قوت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے۔ تفسیر حقانی اور تفسیر ثنائی کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی کی تیسری جلد اسی کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ انھوں نے مولانا عبد الباری ندوی کے فلسفیانہ مباحث کو بنیاد بناتے ہوئے پیغمبروں کے معجزات کو صحیح ثابت کیا ہے۔ دراصل معجزات کا انکار اللہ تعالیٰ کی صفت اختیار کا انکار ہے۔ خرق عادات تو بعض اوقات اولیائے کرام سے بھی صادر ہوئے ہیں، لیکن ان کی کرامات کو استدلال کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ معجزات کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کے اذن کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے اور انہیں معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ سرسید کے عقیدۂ نیچر کے خلاف ظہور میں آتے ہیں۔

۵۔ **احادیث کی حجیت**۔ سرسید کی تفسیر احمدی میں جتنے تفردات ہیں انہیں حالی کی تمام تر کوششوں کے باوجود نہ تو مسلم علماء نے قبول کیا اور نہ مسلم عوام نے، لیکن سرسید نے احادیث کے ساتھ جو سلوک کیا اس نے مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جس نے مکمل طور سے احادیث کی حجیت کا انکار کر دیا۔ یہ بات واضح ہے کہ احادیث پر شکوک وشبہات وارد کرنا مستشرقین کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ وہ قرآن کو معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کی تصنیف اور احادیث کو مشکوک اور مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں منکرین حدیث کا جو ٹولہ پیدا ہوا اسے حدیث سے انکار میں شریعت کے بیش تر احکام پر عمل سے فرار کا ایک عمدہ بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔

یہاں سرسید کے عقیدۂ قرآن پر گفتگو پیش نظر نہیں ہے، بلکہ حالی کی فکر پر مغرب

کے اثرات کا مطالعہ مقصود ہے۔اس کے لیے مندرجہ بالا نکات کافی ہیں۔واضح رہے کہ حالؔی کی ادبی خدمات اور سرسید کی تعلیمی اور سماجی خدمات کو امت نے بطیبِ خاطر قبول کیا ہے اور ان بزرگوں کی قرار واقعی قدر و منزلت کی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان بزرگوں کی قدر دانی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔اس مقالہ میں سرسید کی سیاسی اور دینی فہم پر جو نکیر کی گئی ہے اور جسے مغربی فکر سے مرعوبیت کا شاخسانہ ثابت کیا گیا ہے اس سے ان بزرگوں کی نہ تو اہانت مقصود ہے اور نہ اس سے ان کی اہانت ہی لازم آتی ہے۔ یہ تو دراصل تاریخ اور تفکیر کا عملی تجزیہ ہے۔ ورنہ سرسید کے معروفات مسلمانوں میں مقبول اور منکرات مردود ہو چکے ہیں۔حالؔی کی توضیحات نے بھی اس سلسلہ میں انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ہے۔

حواشی و مراجع

۱ تلخیص حیات جاوید، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶ء، ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۲۶۔
۲ ایضاً، ص ۲۰۔ ۳ ایضاً، ص ۲۱۔
۴ ایضاً، ص ۲۱۔ ۵ حیات سعدی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۰ء، تعارف از رشید حسن خاں۔
۶ تلخیص حیات جاوید، ص ۶۹۔ ۷ ایضاً، ص ۷۔
۸ مالک رام، مقدمہ یادگار غالب، مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۴ء۔
۹ تعارف تلخیص حیات جاوید، ص ۳۹۔ ۱۰ ایضاً، ص ۴۸۔
۱۱ سید عبداللہ، تلخیص، ص ۴۴۔ ۱۲ تلخیص، ص ۷۰۔
۱۳ اس موضوع پر راقم کا مقالہ ''مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان اور اس پر معارضات'' اپریل تا جون ۲۰۰۷ء کے 'تحقیقات اسلامی' میں ملاحظہ ہو۔
۱۴ حیات جاوید۔ص ۵۱۹۔ ۱۵ ایضاً۔ص ۴۱۴۔
۱۶ ملاحظہ کیجیے 'سہ ماہی مطالعات، نئی دہلی، اپریل-جون ۲۰۰۸ء میں راقم کا مقالہ
۱۷ ص ۱۱۵۔ ۱۸ ص ۱۱۵۔
۱۹ ص ۶۵۱۔ ۲۰ ص ۵۲۳۔
۲۱ ص ۵۱۹۔ ۲۲ ص ۵۲۳۔
۲۳ ص ۲۴۔ ۲۴ ص ۶۲۶۔
۲۵ ملخص از صفحات ۶۳ و بعد۔ ۲۶ ص ۶۳۸۔
۲۷ ص ۲۷۲۔

۲۸ دیکھئے تفہیم القرآن (مولٰنا مودودی)، جلد چہارم، ضمیمہ سورہ احزاب، ص ۱۵۴ تا ۱۵۹۔
۲۹ کتاب زبور کے ابواب ۳۷، ۳۸ میں مذکور بشارت کے یہود منتظر ہیں اور عیسائیوں کے لیے تو یوحنا کے مکاشفات (عہد نامۂ جدید کی آخری کتاب) اسی بشارت سے پر ہے۔
۳۰ مکاشفات ۱۶:۱۶۔ ۳۱ حیات جاوید، ص ۶۱۵۔
۳۲ ص ۶۱۷۔ ۳۳ ص ۶۱۸ تا ۶۲۲۔
۳۴ ص ۶۲۲۔
۳۵ سور کی حرمت کے لیے دیکھئے کتاب احبار ۱۱: ۷، خون کی حرمت کے لیے احبار ۳:۱۷، ۲۶:۱۹ نیز کتاب استثناء ۱۶:۱۲، میتہ (مردار) کی حرمت کے لئے استثناء ۲۱:۱۴، تذکیہ کے لیے احبار ۱:۱۵ نیز پورا چوتھا باب۔ قربانی پر اللہ کا نام لینے کے لیے بائبل میں صرف کاہن کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ یہودیوں کے یہاں آج بھی ان احکام پر عمل ہو رہا ہے۔
۳۶ دیکھئے انجیل متی ۵: ۱۷، ۱۸۔ ۳۷ دیکھئے پولس کا خط رومیوں کے نام ۳:۲۰، ۲۱۔
۳۸ ''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے'' (انجیل متی ۵: ۱۷، ۱۸)۔
۳۹ ''شریعت کے اعمال سے کوئی بشر اس کے حضور راست باز نہیں ٹھیرے گا۔ اس لیے کہ شریعت کے وسیلہ سے تو گناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے۔ مگر اب شریعت کے بغیر خدا کی ایک راست بازی ظاہر ہوگئی ہے، جس کی گواہی شریعت اور نبیوں سے ہوتی ہے'' (رومیوں کے نام پولس کا خط، ۳:۲۰، ۲۱)۔
۴۰ یہ پورا حکم توریت میں بھی پایا جاتا ہے، ملاحظہ ہو، دو بہنوں کو جمع کرنے کی ممانعت، احبار ۱۸:۱۸، پھوپھی اور خالہ سے تعلق قائم کرنے کی حرمت، احبار ۱۸:۱۲، ۱۳۔
۴۱ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''مسئلۂ امام مہدی آخرالزماں'' از مولانا محفوظ الرحمٰن، مکتبہ ابوالہیم، مئوناتھ بھنجن، ۱۹۰۴ء۔
۴۲ تفہیم القرآن، ۴/۱۵۴-۱۵۹
۴۳ صحیح بخاری، کتاب الاذان: ۸۳۲، صحیح مسلم، کتاب المساجد: ۵۸۹، سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ: ۸۸۰، سنن نسائی ۳/۵۸)
۴۴ دیکھئے انجیل متی۔ ابواب ۸، ۹۔

بیسویں صدی میں تجدیدی تحریکات اور علماء

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

بیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام میں مختلف اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ ان کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں تھی۔ ان تحریکوں کے پس منظر میں ان یورپی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں تھیں جنھوں نے عالم اسلام کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ یورپی استعمار نے عالم اسلامی پر یلغار کرکے اسلامی ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، حتیٰ کہ انیسویں صدی میں ترکی کے علاوہ کوئی آزاد اسلامی ملک نہ رہ گیا تھا۔ پھر جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو اس وقت مختلف ملکوں میں علماء نے اسلامی بیداری کی تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں میں مصر میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور رشید رضا نے مسلمانوں کے ذہین طبقے کو متأثر کیا اور اسلامی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جمال الدین افغانی جہاں بھی رہے، انھوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ تحریک الاخوان المسلمون اصلاً اُس فکری دھارے سے مل جاتی ہے جسے سید جمال الدین افغانی نے مصر میں شروع کیا اور محمد عبدہ نے پروان چڑھایا تھا، جس کو سید رشید رضا نے المنار کے صفحات میں پیش کیا تھا، وہی دینی تحریک حسن البنّا کے فکری رجحانات کی ترجمان ہے۔ یہ پورا سلسلہ اصلاً جمال الدین افغانی کے افکار کی آواز بازگشت ہے، ہرچند کہ شیخ حسن البنّا اصطلاحی معنیٰ میں عالم دین نہ تھے، لیکن اسلامی فکر اور اس کی روح پوری طرح جذب کیے ہوئے تھے۔

ترکی میں شیخ بدیع الزماں نورسی نے 'النور' کے نام سے تحریک شروع کی۔ انھوں نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جو رسائل لکھے ان کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے۔ لکھے ان کی وجہ سے اسلامی اثرات ترکی میں عام ہوئے۔ شیخ نورسی ترکی کے بڑے

علماء میں سے تھے۔ انھوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کا مقابلہ کیا اور اس کے انقلاب کو اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ شیخ نے مصطفیٰ کمال کو دشمن دین اور دجّال قرار دیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا، مگر وہ اس میں بری ہو گئے، پھر بھی حکومت نے ان کو جیل بھیج دیا، انھیں مختلف جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ شیخ سے عدالت میں پوچھا گیا: کیا آپ قوانین شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، میں شریعت کا قانون چاہتا ہوں۔ شیخ نے مزید کہا کہ اگر میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو بھی میں ان کو احکامِ شریعت میں سے کسی ایک حکم کے لیے قربان کر دینے میں تذبذب محسوس نہ کرتا۔ شیخ نورسی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید نسل کے ذہن میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم کر دیا۔ [۱]

ترکی میں جو سیکولر تحریک کمال اتاترک نے شروع کی اور حکومت کے ذریعہ سیکولرزم کو نافذ کیا، اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے شیخ نورسی نے اپنے رسائل کے ذریعے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی اور اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو جدید نسل کے ذہن میں جاگزیں کر دیا۔ اسی دور میں پروفیسر محمد مجیب نے ترکی کا دورہ کیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا: ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے بیس ہزار سیکولر مدرسے کھولے، اس کے جواب میں علماء نے چالیس ہزار اسلامی مدرسے کھولے۔ اس وقت ترکی میں جو اسلامی تحریک چل رہی ہے یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ دراصل جماعۃ النور کا ہی تسلسل ہے۔

انڈونیشیا میں بیسویں صدی میں ہالینڈ کی استعماری طاقت کے خلاف مسلّح جد و جہد میں علماء نے جو اعلیٰ کردار ادا کیا وہ اظہر من الشّمس ہے، خصوصاً دارالاسلام پارٹی، نہضۃ العلماء اور مشجومی پارٹی نے جو بنیادی رول ادا کیا ہے، اس میں علماء کا بڑا اثر رہا ہے۔

نائجیریا میں شیخ عثمان بن فودی نے الجماعۃ کے نام سے ایک پارٹی بنائی اور اس کے ذریعے ردّ بدعت کا عظیم کام انجام دیا۔ وہ در اصل سعودی عربیہ کی وہابی

تحریک کا اثر تھا۔ ہر چند کہ یہ تحریک انیسویں صدی میں اٹھی، مگر اس کے اثرات نائجیر یا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ شیخ عثمان بن خودی اور شیخ امین کاتمی اپنے دور کے بڑے علماء میں سے تھے۔ شیخ عثمان کی بہت سی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہاں بیسویں صدی میں ایسی بہت سی تحریکیں اٹھیں جن کے قائد علماء کرام تھے ۔ انھوں نے ایک طرف انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت میں قائدانہ رول ادا کیا تو دوسری طرف تعلیمی تحریکوں کو آگے بڑھایا اور اصلاح امّت کا کام کیا۔ تعجب ہے کہ سرسید کو علماء کی صف میں شمار نہیں کیا جاتا، حالاں کہ وہ ایک بڑے عالم دین تھے۔ انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی، جو پوری نہ ہوسکی۔ خطباتِ احمدیہ کے نام سے سیرت نبوی پر کتاب لکھی اور دوسرے اصلاحی کام کیے۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کالج قائم کیا، جو ترقی کرتے کرتے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی بن گیا۔ سرسید نے بیسویں صدی نہیں پائی، مگر ان کے اثرات بیسوی صدی پر محیط ہیں۔ علماء کرام نے دیوبند میں ایک بڑا مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم کیا، پھر ۱۸۹۳ء میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک تعلیمی تحریک چلائی۔ اس طرح بیسویں صدی کے شروع میں مختلف اصلاحی ادارے قائم ہوئے اور تحریکیں وجود میں آئیں۔ بعد میں انہی تحریکوں سے ایسی شخصیتیں ابھریں جنھوں نے اسلامی ذہن وفکر میں انقلاب برپا کردیا۔

ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا ذکر ضروری ہے، جن کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ انھوں نے الندوہ نکالا، مگر لکھنؤ سے جو مسلم گزٹ نکل رہا تھا وہ بھی انہی کی آواز تھی۔ مولانا شبلی نے ایک مقالہ 'مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ' لکھا جو مقالاتِ شبلی کی آٹھویں جلد میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے مسلمانوں کو ملامت کی کہ ''تم اپنا حصّہ طلب کرتے ہو، مگر ملک میں انگریزوں کے خلاف جو قومی جدوجہد ہورہی ہے اس سے الگ تھلک ہو''۔ علامہ شبلی

نے فرمایا کہ ''دیکھو پارسی ایک چھوٹی سی قوم ہے، مگر اس نے دادا بھائی نوروزی جیسا لیڈر پیدا کر دیا'' یہ مولانا شبلی کی آواز اور ان کی تربیت تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں میں آزادی کا صور پھونک دیا، 'الہلال' کے ذریعہ ان کو جھنجھوڑا اور ایک آواز سے سوتی بستی کو جگا دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان جوق در جوق کانگریس میں شامل ہونے لگے۔ خود مولانا شبلی نے مسلم لیگ کے خلاف نظمیں لکھنی شروع کیں، جو الہلال میں شائع ہوئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی آواز درحقیقت علامہ شبلی کی آواز کی بازگشت تھی۔ الغرض مولانا آزاد کے علاوہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور دوسرے علماء نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ ان تعلیمی کوششوں نے سیاسی زندگی پر بھی اثر ڈالا اور مسلمانوں میں سیاسی و مذہبی بیداری پیدا کی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی کئی تحریکیں ابھریں۔ ان میں تحریک خلافت، تحریک جمعیۃ علماء ہند، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی قابل ذکر ہیں، ان سب کے قائدین علماء ہیں، یا ان میں علماء شامل ہیں۔ خلافت کی تحریک علماء نے نہیں چلائی، مگر اس میں ان کا رول بہت اہم تھا۔ علاّمہ سید سلیمان ندوی نے وفد خلافت میں شرکت کی اور لندن گئے۔ تحریک خلافت نے بقول مولانا آزاد ایک بنیادی رول ادا کیا، اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا، ان کو سیاست میں سرگرم ہونے کا سلیقہ سکھایا اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ اگر ہندو انتہا پسند عناصر نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں چلا کر خلافت کے اثرات کو زائل نہ کیا ہوتا اور موتی لال نہرو نے نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کیا ہوتا تو تقسیم کا عمل وجود میں نہ آتا۔

نہرو رپورٹ نے مسلمانوں پر کاری ضرب لگائی اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے لوگ کانگریس سے باہر نکل آئے۔ مسٹر جناح نے بھی کانگریس کو اسی موقع پر ترک کر دیا۔

ہندوستان کی دو تحریکیں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت بیسویں صدی میں

شروع ہوئیں، ان کے بانی بھی طبقۂ علماء میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب آریہ سماجیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلائیں تو مسلمانوں نے ان کے بارے میں غور وفکر کیا۔ یہ ہندو تحریکیں دراصل ان مسلمانوں کو، جو پہلے ہندو تھے بعد میں دائرۂ اسلام میں آ گئے تھے، دوبارہ ہندو بنانے کے لیے شروع ہوئی تھیں۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے تبلیغی تحریک کا آغاز کیا۔ انھوں نے ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء میں حج کیا اور پانچ مہینے مدینے میں قیام کیا۔ اس قیام کے درمیان ان کو خواب میں حکم دیا گیا کہ ''تم سے کام لیا جائے گا''، مولانا بہت بے چین ہوگئے اور اس واقعہ کا ذکر ایک عارف باللہ سے کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا: آپ پریشان نہ ہوں، آپ سے کہا گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ لہٰذا تم سے کام لینے والے کام لیں گے۔ مولانا الیاس صاحب فرماتے ہیں: ''اس قول سے مجھے بڑی تسلّی ملی''۔[۲]

حج سے واپسی کے بعد مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جماعتیں بنا بنا کر گردونواح میں بھیجنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اس کام کا آغاز میوات سے کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح لوگوں کا ذہن اور ماحول بدل جائے گا۔ اس لیے کہ عام لوگوں کا ذہنی ماحول ان مسائل میں پھنسا ہوا ہے جن میں وہ رہتے ہیں۔ اس ماحول سے نکال کر اگر انھیں دینی ماحول میں رکھا جائے تو ان کے اندر نفسیاتی اور مذہبی تبدیلیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بعد میں مولانا خود بھی بڑے بڑے مجمعوں کے ساتھ نکلنے لگے۔ وہ میوات گئے، کاندھلہ اور رائے پور کو جماعتیں بھیجیں، انھوں نے میوات کی آبادی کا ایک نقشہ تیار کرایا اور اس کے مطابق پورے میوات میں جماعتوں کا جال بچھا دیا، جس کی وجہ سے اس علاقے میں دینی ماحول پیدا ہوگیا۔[۳]

تبلیغی جماعت کے ذریعے جو تغیّرات اہل میوات کی دینی زندگی میں پیدا ہوئے اسے ایک بوڑھے میواتی نے اس طرح بیان کیا: ''میں کچھ نہیں جانتا، اتنا جانوں ہوں کہ جن باتوں کے لئے پہلے بڑی بڑی کوشش کی جاتی تھی اور ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی وہ اب آپ ہی آپ ہو رہی ہیں۔ جن باتوں کو پتہ کرنے کے لیے بڑی بڑی

لڑائیاں لڑی جاتی تھیں اور بڑا زور لگایا جاتا تھا، مگر ایک بات بھی نہ ہوتی تھی، وہ اب بے کہے سنے خود بہ خود ہوتی جارہی ہیں۔ مولانا الیاس کے نزدیک اس تغیّر کا سبب وطن سے باہر نکلنا اور دینی مراکز میں جانا ہے۔[۴]

بیسویں صدی میں ہندوستان میں ایک دوسری منظّم تحریک اٹھی جو جماعت اسلامی کے نام سے معروف ہے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے ذہین طبقے کو متأثر کیا، اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں۔ انھوں نے اسلامی افکار کو ایک نئے انداز سے پیش کیا اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی۔ ان کا دور اصل میں اشتراکیت کے فروغ کا دور تھا جو زندگی کو ایک خاص رُخ دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا نے عقلی اور منطقی انداز میں اسلام کا ایک وسیع اور انقلابی نظریہ پیش کیا، جس کے مطابق اسلام انسانی زندگی کو روزہ نماز تک محدود نہیں کرتا، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کو متأثر کرتا ہے، حتّٰی کہ اس کا اثر سیاست اور معاشیات پر بھی پڑتا ہے۔ مولانا مودودی کی ان کوششوں سے مسلمان نوجوانوں کا ذہین طبقہ اشتراکیت کے زہر سے محفوظ رہا۔ جماعت اسلامی نے اس حیثیت سے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

حق یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی اصلاحی تحریک سے نوجوان طبقے کو مغربی تہذیب کے مضر اثرات سے بچایا اور اسلامی فلسفۂ زندگی سے آگاہ کیا، ورنہ یہ طبقہ اشتراکیت کا شکار ہو جاتا۔ انھوں نے ایسا لٹریچر پیش کیا جس نے ہزاروں مسلمانوں کی زندگیوں کو بدل دیا۔ ان کا طرز نگارش منطقی ہے۔ ان کی قوت استدلال جدید ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی تحریروں میں علوم اسلامیہ کا گہرا مطالعہ نظر آتا ہے۔ وہ ان مسائل سے بحث کرتے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا تعلق روزمرہ کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی سے ہے۔ پردہ، سود، الجہاد فی الاسلام، ضبط ولادت، حجّیتِ حدیث جیسے مسائل پر ان کی تحریریں عالمانہ شان رکھتی ہیں۔ ان کی تفسیر تفہیم القرآن بہت متداول اور مقبول ہے۔ اس تفسیر میں انھوں نے تحریک اسلامی کی روح پیش کردی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی دور جدید کے سب سے بڑے متکلّم ہیں، جنھوں نے

دفاع اسلام کی قابل قدر اور اہم خدمت انجام دی ہے۔ان کا مقام بڑے علماء کی صف میں ہے۔

عالم اسلام میں جو تجدیدی تحریکیں بیسویں صدی میں شروع ہوئیں ان کا تعلق کسی حد تک انیسویں صدی سے ہے۔یہ تحریکیں علماء نے مغربی استعمار سے مدافعت کے لیے شروع کیں۔انھوں نے مسلمانوں کو مغربی طاقتوں کی سازشوں سے آگاہ کیا اور مسلّح جہاد کیا۔اگر ہم انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں مختلف ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ ان میں جو تحریکیں آزادی اور دفاع اسلام کی اٹھیں ان میں علماء کا رول بہت روشن ہے۔ہم دیکھیں گے کہ ہر ملک میں علماء دفاع اسلام کی تحریکوں کے قائد ہیں، یا وہ ان طاقتوں کے ساتھ ہیں جو آزادی اور جمہوریت کے اصولوں سے ہم آہنگی رکھتی ہیں۔

دور جدید میں روس کے خلاف افغانستان کے علماء کا رول بڑا قابل تعریف ہے۔انھوں نے کئی تحریکیں چلائیں اور کئی جماعتیں بنائیں اور روس سے جنگ کر کے ایک سُپر پاور کو ذلت و نامرادی کے ساتھ افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جس خطّے میں استعمار حملہ کرتا ہے علماء صف اول میں نظر آتے ہیں۔بیسویں صدی میں علماء کے ساتھ اگرچہ دوسرے عناصر بھی شریک جہاد ہوئے، مگر علماء نے اپنے قائدانہ رول سے اسلام کی عظمت کی مشعل کو روشن رکھا ہے اور جہاں بھی عالم اسلام میں دفاع اسلام کا کام ہوا ہے اس میں علماء نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

حواشی

۱۔ جماعۃ النور از فتحی یکن 'الامت' دوحہ، قطر، ص ۶۷ تا ۷۹، جلد اول، شمارہ ۶، اپریل ۱۹۸۱ء

۲۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۰

۳۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۵۷ تا ۷۷

۴۔ ایضاً، ص ۸۹

مراجع

(۱) مقالہ جماعۃ النور فتحی یکن، مجلّہ الامّۃ، قطر، اپریل ۱۹۸۱ء
(۲) صفحات من تاریخ اندونیشیا المعاصرۃ، محمد اسد شہاب، طبع اول ۱۹۷۰ء
(۳) السنوسی الکبیر، شائع کردہ حکومت لیبیا
(۴) الاسلام فی نیجیریا، عبداللہ الوریٰ
(۵) دیوبند اور علی گڑھ تحریک، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (علی گڑھ تحریک، نسیم قریشی)
(۶) زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، احمد امین
(۷) جمال الدین الافغانی، عبدالقادر المغربی
(۸) محمد عبدہ، مصطفیٰ عبدالرزاق، دارالمعارف مصر
(۹) علمائے حق، (حصہ اول) مولانا محمد میاں، مطبوعہ دیوبند
(۱۰) حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی
(۱۱) تحریک خلافت، قاضی عدیل عباسی
(۱۲) محمد علی کی ذاتی ڈائری، مولانا عبدالماجد دریابادی
(۱۳) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
(۱۴) مولانا مودودی کی تحریک اسلامی، محمد سرور ۱۹۵۶ء

دعوت وتربیت- اسلام کا نقطۂ نظر

مولانا سید جلال الدین عمری

یہ کتاب دوطرح کے مضامین پر مشتمل ہے۔ کچھ مضامین دعوتی نوعیت کے ہیں۔ ان میں پورے زور اور قوت کے ساتھ امت کو فریضۂ دعوتِ دین کی ادائیگی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اس کے تقاضوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس معاملے میں کوتاہی کے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ کچھ مضامین تربیتی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں۔ ان میں امت کو اصلاح احوال کی جانب متوجہ کیا گیا ہے اور اس کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں قرآن وحدیث سے استناد واستدلال کے ساتھ عقلی اپیل بھی ملتی ہے۔ صفحات: ۱۳۶، قیمت -/۵۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

نقد و استدراک

اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی - ایک جائزہ

جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ کی جولائی - ستمبر ۲۰۰۸ء کی اشاعت میں جناب ڈاکٹر اوصاف احمد صاحب کے قلم سے ایک تحریر 'اسلامی تناظر میں مالیاتی پالیسی' کے زیر عنوان پڑھنے کا موقع ملا۔ اس تفصیل کے ساتھ شاید اس موضوع پر یہ پہلی تحریر ہے۔ اس لیے اس میں کمی بیشی کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔

سب سے پہلے 'مالیاتی پالیسی' پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ اس کا انگریزی میں MONETARY POLICY صحیح ترجمہ ہوگا، لیکن سوال 'مالیاتی' کے ترجمہ کا ہے جس کو انگریزی میں FINANCIAL کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے اردو میں نقدی سیاست/ سیاستِ نقدیہ/ پالیسی نقود/ نقد کی حکمت عملی وغیرہ کوئی ایسی اصطلاح استعمال ہونی چاہیے جس میں نقد اور اس کے مشتقات میں سے کسی مشتق کا موجود ہونا ضروری ہے، جیسا کہ اس اصطلاح کے انگریزی اور عربی ترجموں سے واضح ہوتا ہے۔

یہ امر اس لیے ضروری ہے کہ سیاستِ نقدیہ اس سیاست مالیہ کا محض ایک جز ہے جس میں ٹیکس اور دیگر ذرائع آمدنی کے ساتھ مختلف میدان ہائے حیات میں اس آمدنی کو خرچ بھی کرنے کا ذکر ہوتا ہے۔

دوسری بات جو عرض کرنی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی بینکنگ سسٹم کے مکمل خاکے کے بجائے صرف مرکزی بینک کے فرائض اور رول کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ انہوں نے اس اسلامی بینکنگ سسٹم کو ایسے ماڈل کی بنیاد قرار دیا ہے جو مضاربت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے اپنے مضاربت کے

کیا اصول اور قواعد ہیں؟ اس کی تفصیلات جانے بغیر ان بہت سے مسائل کے بارے میں، جن کا تعلق امانتوں (DEPOSITS) اور تخلیقِ زر اور ان فیصدی نسبتوں سے ہے جن کی بنیاد پر مرکزی بینک کو امانتوں کے متعین حصوں کا اپنے ہاں محفوظ رکھنا ضروری ہے وغیرہ، کوئی رائے قائم کرنا بہت دشوار ہے، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے خود تصورِ مضاربت، اس کے عصر حاضر کے بینکنگ سسٹم میں نفاذ یا عدم نفاذ، مناسبت اور عدم مناسبت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

سیدھے سادے الفاظ میں اصل مضاربت کا تصور، جس کا ذکر حدیث (مؤطا امام مالکؒ) یا فقہ (کتاب الام للشافعیؒ) میں ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ مضاربت دو افراد کے درمیان ایک ایسا کاروباری معاملہ/ لین دین/ معاہدہ ہے جس میں ایک کے پاس مال ہوتا ہے، جس کو وہ نفع بخش کاروبار میں لگا کر اس کی نشو ونما چاہتا ہے، جب کہ دوسرے شخص کے پاس کسی خاص کاروباری میدان میں تجربہ ہوتا ہے۔ مال دار شخص اپنی شخصی معرفت اور تجربات کی بنیاد پر کسی خاص میدانِ کاروبار میں تجربہ کار شخص سے یہ اتفاق/ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس خاص میدانِ عمل میں اپنی جدوجہد اور محنت سے منافع کمانے کی کوشش کرے۔ اگر فائدہ ہوا تو وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے، مثلاً ۶۰% (مالدار) ۴۰% (تجربہ کار/ عامل) کی بنیاد پر نفع تقسیم ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ نقصان ہوا تو عامل (کام کرنے والے) کی محنت رائیگاں قرار پائے گی اور پورے کا پورا نقصان سرمایہ دار/ مال دار کو برداشت کرنا پڑے گا۔

اس تصور کے اہم اجزائیہ ہیں:

.....شخصی معرفت

.....شخصی طور پر نفع ونقصان کی نسبتوں کا تعین

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاہدہ کا تعلق خالص انفرادی اور شخصی بھروسہ پر ہوتا ہے جو مال دار کی طرف سے طے پاتا ہے۔

اگر اس تصور کے تحت عصر حاضر کے بینکنگ سسٹم پر نظر ڈالی جائے تو یہاں

دونوں کے بیچ میں بینک آ جاتا ہے جس کا رول کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:

امانت داروں سے اکاونٹ کھلواتے وقت بینک ایک مطبوعہ فارم پر اپنی پہلے سے طے شدہ شرائط پر، امانتیں قبول کرکے ان امانتوں کو دیگر کھاتے داروں کی رقومات کے ساتھ ملا کر مختلف تاجروں/ سرمایہ کاروں (ENTERPRENURE) کو بھی اپنی شرائط پر مضاربت کی بنیاد پر امانت داروں کے وکیل کی حیثیت سے سرمایہ کاری کے لیے دیتا ہے۔

یہاں صورت حال قدیم مضاربت سے بالکل مختلف ہے۔ نہ تو امانت دار ہی سرمایہ کار/تاجر کو جانتا ہے اور نہ ہی سرمایہ کار تاجر/ امانت دار کو۔ بینک ہی وہ واحد ادارہ ہے ..... نہ کہ فرد ..... جو تاجر/ سرمایہ کار سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور اس کی بازار میں ساکھ (Reputation) اور سابقہ تجارتی / سرمایہ کارانہ سرگرمیوں اور ان کے اچھے یا برے نتائج سے براہ راست یا بالواسطہ دوسرے بینکوں/تاجروں یا خود اس کے اپنے ادارۂ معلومات وخطرات (Information & Risk Dept.) کے ذریعہ اس کے متعلق ضروری معلومات جمع کرتا' ان کی نوعیت کا تعین کرتا اور ان کی روشنی میں تاجر/ سرمایہ کار کی قدر وقیمت (EVALUATION) کا تعین کرتا ہے اور بالآخر یہ فیصلہ اپنی دیگر معلومات (مثلاً مارکیٹ میں اس خاص مال یا چیز یا منصوبے کی طلب وضرورت) کی روشنی میں کرتا ہے کہ آیا اُسے یہ مضاربت کی رقم دی جانی چاہیے یا نہیں؟ یہاں ایک اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے: کیا بینک کو ان زرکاری کے فیصلوں کے نتائج بھگتنا چاہیے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر بینک کو بھی بحالت خسارہ امانت دار اور تاجر/ زرکار کے ساتھ شریک ہونا چاہیے، کیونکہ وہ نفع کی صورت میں نفع کا ایک حصہ خود لے کر باقی حصہ امانت دار کے حوالہ کرتا ہے، جیسا کہ سودی بینک کا حال ہے کہ وہ اسی شرح سود سے زیادہ شرح سود پر تاجر/ زرکار کو قرض دیتا ہے جو وہ امانت دار کو دینے کا عہد کرتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اگر بینک صرف نفع میں شریک ہوتا ہے اور نقصان میں شریک نہیں ہوتا، تو اس کا نفع سے حاصل کیا ہوا مال 'سود' شمار ہوگا، کیونکہ

شریعت میں حلال مال وہی ہے جس میں مغرم (LOSS) کے ساتھ مغنم (PROFIT) بھی ہو۔ اس کے برعکس جو شخص یا ادارہ صرف نفع میں شریک اور نقصان سے دامن کشی کرے وہ دراصل سود کھاتا ہے۔

اس تفصیل سے جدید بینک کاری کی حقیقت واضح ہورہی ہے جس پر قدیم مضاربت کے تصور کو چسپاں کیا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ دونوں میں جو فرق (DIFFERENCES) پائے جاتے ہیں ان کا تعین کیا جائے اور ان کی روشنی میں نئے نظام بینک کاری میں ان کے بقا وعدم بقا کا فیصلہ کیا جائے۔

جدید بینکنگ سسٹم میں بینک بڑی چالاکی سے اپنے اور امانت داروں کے خطرات (Bank's and Depositors' Risks) کا بوجھ (Burden) تاجر/زرکار کے کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں جو ان کو آخری چارۂ کار کے طور پر صارفین (Ultimate Consumer) سے وصول کر کے قیمتوں میں مصنوعی اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ یہی اس سسٹم کا سب سے بڑا اور خطرناک پہلو ہے۔ یہ پہلو رہن عقاری کے حالیہ بحران میں (Current Mortgage Crisis) میں کھل کر سامنے آیا جب مکان کے خریدار ڈالر کی قیمت میں غیر معمولی کمی اور اس کی بڑھتی ہوئی گرانی کے مقابلے گرتی ہوئی قیمت خرید کی وجہ سے اپنے قرضوں کی قسطوں (Premium) کو ادا کرنے سے قاصر ہوگئے ہیں۔ اب چونکہ مکانوں کے خریداروں کا کُل اثاثہ/سرمایہ (Asset / Capital) خود خریدا ہوا مکان ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کو اسی کے مکان سے بے دخل کر کے سڑک پر پھینک دیا جائے۔ مگر یہ حل مکان کو فوراً نقد (Immediate Cash) میں نہیں بدل سکتا۔ بحران کے دنوں میں مکانوں کا بکنا ایک مسئلہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے بینک اور مالی اداریہ نقود کی کمی کی وجہ سے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور ہورہے ہیں اور مستقبل میں ان دیوالیہ ہونے والے بینکوں اور اداروں میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ یہ بڑا خطرناک مالی اور اقتصادی بحران ہے۔ اس میں Sub-Prime مارکیٹ میں کاغذی مستندات .....محض بے معنی کاغذی مستندات ..... کی خرید وفروخت کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس کی تفصیلات کا مطالعہ نیویارک ٹائمز میں اور رائٹرس نیوز ایجنسی کے شائع شدہ ان دومقالوں سے کیا جاسکتا ہے جو دکن کرانیکل کی ۵/ اگست ۲۰۰۸ء اور ۱۶-۱۷ اگست ۲۰۰۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مالی اور اقتصادی طوفان جسے رہن عقاری کے بحران نے پیدا کیا ہے۔ اس کو اس طرح واضح کیا جاسکتا ہے:

جدید بینکنگ نظام میں خطرات کی تقسیم

آخری صارف Ultimate Consumer قیمت + واجب الاداء سود Price+Pay able Interest	تاجر/ زرکار Inverstor/ Trader All Risks تمام خطرات	بینک Bank کوئی خطرہ نہیں No Risk	امانت دار Depositor کوئی خطرہ نہیں No Risk

یہ موجودہ اقتصادیات میں گرانی کے بڑھنے میں ایک اہم عنصر کا رول ادا کرتا ہے، کیونکہ اپنی روزمرہ کی ہر ضرورت پر ہم سود ادا کرتے ہیں اور گرانی (Inflation) میں اضافہ کو خوشی خوشی برداشت کرتے ہیں!!!

اس حقیقت کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

اس لیے صحیح اسلامی بینکنگ وہی ہے جس میں سود کے عنصر کو پوری طرح نکال باہر کیا جائے اور نفع ونقصان میں شرکت کے اصول کو سارے ہی مراحل میں پیش نظر رکھا جائے۔ اس غرض کے لیے میں نے ایک نظریہ پیش کیا ہے جس کو میں 'خطرات کی منصفانہ تقسیم کا نظریہ' (Equitable Distribution of Risks Concept) کا نام دیتا ہوں:

اس میں امانت دار، بینک اور تاجر/ زرکار سب ایک متفقہ تناسب سے نفع ونقصان میں شراکت کو قبول کرتے ہیں۔

تاجر/ زرکار Inv estor/ Trader ۵۰ % دونوں حالتوں میں	بینک Bank ۲۵% نفع نقصان دونوں حالتوں میں	امانت دار Depositor ۲۵ % دونوں حالتوں میں

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان تینوں کے سرمایوں کی مقدار بھی نفع ونقصان کی طرح آپس میں رضامندی سے طے کرسکتے ہیں مثلاً:

تاجر/زرکار Investor/Trader	بینک Bank	امانت دار Depositor
۳۰% کسی پروجیکٹ کا سرمایہ	۳۵% کسی پروجیکٹ کا سرمایہ	۳۵% کسی پروجیکٹ کا سرمایہ

اس طرح نفع ونقصان اور سرمایوں کی فیصدی نسبتوں میں کمی بیشی آپسی بات چیت سے طے ہوسکتی ہے۔ یہ ایک قابل تبدیل (Variable) عنصر (Factor) ہے۔ اس طرح ہم سود کے عنصر کو بینکنگ سسٹم سے کلیۃً نکال سکتے ہیں۔ مگر اس میں بینک کو اپنا سرمایہ کاروبار کی ترقی اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اور نقصان کی خانہ پری (Compensation) کے لحاظ سے بڑھاتے رہنا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر اب تک بینک کا سرمایہ جامد (Static) ہوا کرتا تھا، جب اس کا تعین بینک کی تأسیس کے وقت کردیا جاتا تھا کہ اس بینک کا سرمایہ دس ملین ڈالر ہے، مگر اس نئے تصور کے تحت بینک کو اپنا سرمایہ وقتاً فوقتاً بڑھانا پڑے گا، کیونکہ راس المال متحرک (Dynamic) ہوگیا ہے!!! وہ راس المال میں بھی شریک ہے اور نفع ونقصان میں بھی شریک ہے!!! یہی صحیح اور اسلامی شراکت ہے!!!

اس تصور کو میں نے اپنے پمفلٹ: Organisation of the Credit Operations Under the Islamic Banking System میں پیش کیا تھا جس کو اسلامی ریسرچ اکیڈمی کراچی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا اور اس پر سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ کے اپریل-جون ۱۹۸۸ء کے شمارے میں تبصرہ بھی شائع ہوا۔

۱۹۹۳/۱۹۹۴ء کے لگ بھگ ۷ بڑے ملکوں کے مرکزی بینکوں کے گورنروں نے اپنے بازل کے اجتماع میں کفایت راس المال (Capital Sufficiency) کے تحت چند ضوابط منظور کیے، تاکہ بینک ناقابل تحصیل (Uncollectible) قرضوں کی تلافی کے لیے ایک خاص مدت گزرنے پر نیا راس المال انجکٹ کرتے رہیں، تاکہ ناقابل تحصیل قرضوں کی تلافی کے ساتھ کفایت راس المال کی کم از کم سطح ومقدار برقرار رہ سکے اور بینکس اور بحیثیت مجموعی نظام بینک کاری کسی بڑے بحران کا شکار نہ ہوسکے۔ چونکہ سودی بنیادوں پر قائم بینکوں کو تخلیقِ زر کی چاٹ لگ چکی ہے اور وہ دوسروں کے مال سے بھرپور

فائدہ اٹھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اس لیے وہ اس ملائی (Cream) کو ہر قسم کے حیلے بہانے سے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ رہن عقاری میں انھوں نے اپنے لیے یہ راہ نکال کر اپنے تخلیق کردہ زر کو لگا دیا۔ یہ میرا قیاس ہے، ہوسکتا ہے کہ غلط ہو۔ اس میں کمرشیل بینکوں کے رول پر ریسرچ ہونے کی ضرورت ہے۔

چونکہ اسلامی نظام بینک کاری پر قلم اٹھانے والے حضرات خطرات Risks کے علم میں زیادہ گہرائی نہیں رکھتے تھے اور آج بھی نہیں رکھتے ہیں، اس لیے انہوں نے میرے مجوزہ نظامِ بینک کاری پر توجہ نہیں دی۔ اگر وہ 'اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبوا' (البقرۃ: ۲۷۵) (تجارت تو محض سود کی طرح ہے) کی روح کو اچھی طرح سمجھ لیتے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کے اسباب اور نتائج کو اپنی فکری گرفت میں لے آتے اور مضاربت میں خسارے کی حالت میں راس المال میں کمی کے مقابلے میں عامل کی مزدوری کے غیر مستحق قرار دیے جانے کے اسباب، جن میں سب سے پہلا سبب یہ اصول ہے کہ نقصان کے ساتھ نفع ہے، کو پیش نظر رکھتے، تو انہیں صاف نظر آتا کہ خطرے کو برداشت کیے بغیر نفع میں شرکت ایک نہایت نامعقول اور مضحکہ خیز بات ہے!!!

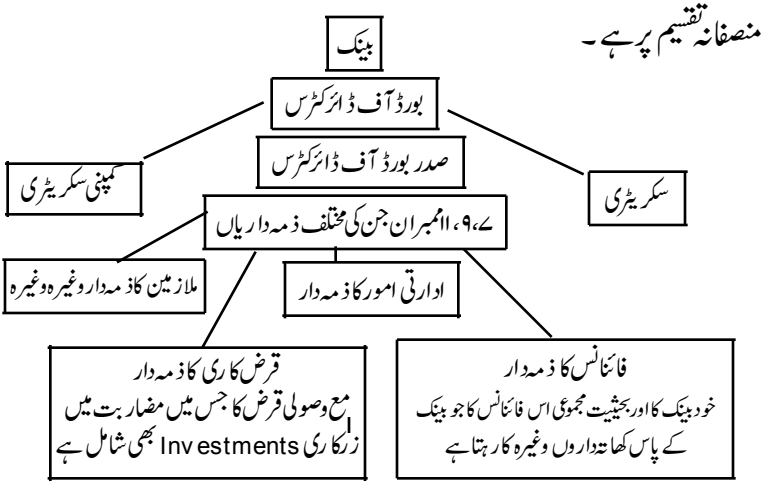
میں اسلامی اقتصادیات پر لکھنے اور سوچنے والے حضرات سے عام طور پر اور اسلامی نظامِ بینک کاری پر لکھنے والے حضرات سے خاص طور پر توقع کرتا ہوں کہ وہ مالی، اقتصادی اور تجارتی امور میں خطرات (Risks) کی اہمیت اور ان کو کم از کم کرنے کے طریقوں اور اقدامات پر مسلسل غور وفکر کرتے رہیں۔ اس میں وہ کسی فرد، ادارے اور حکومت کے مالی موقف کے بارے میں مطلوبہ معلومات کو جمع کرنے اور ان کے متوازن تجزیے کے بعد صحیح نتائج تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

جب تک خطرات کا عنصر اسلامی بینکنگ سسٹم میں خاص طور پر اور اقتصادی نظام میں عام طور پر اپنی اہمیت نہ منوالے اور اسلامی معیشت اور مالی نظام کے ماہرین اس پر بھرپور علمی توجہ نہ دیں تب تک سود سے خالی نظامِ معیشت کا تصور ایک خوابِ پریشان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہاں ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ سودی نظام پر مبنی ذرائع/آلات (Instruments) کو ان کی سودی بنیادوں کی وجہ سے نظر انداز کرنا یا ان کو ان کی خطرناکیوں کے برابر اہمیت دے کر ان سے شکلاً (Form) اور مضموناً (Content) دامن کشی اختیار کرنا، بلکہ احتراز برتنا از حد ضروری ہے، ورنہ بات اس چرواہے کی طرح ہوسکتی ہے جو بادشاہ کے لئے خاص کردہ زمین کے کنارے اپنی بکریاں چراتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ وہ حدودِ ملکِ السمٰوات والارض میں خود اپنی بکریوں کے ساتھ داخل ہوکر قہرِ الٰہی کا شکار نہ ہوجائے۔

میں اس وارننگ کے کچھ لمبے ہوجانے پر معذرت خواہ نہیں ہوں، کیونکہ اس کے عدم ادراک نے اب ماہرین معاشیات و مالیات کو یہ کہنے پر مجبور کردیا ہے کہ جو نام نہاد اسلامی بینکی ادارے آج کام کررہے ہیں وہ بے دھڑک رائج الوقت سود پر مبنی ذرائع/آلات (Instruments) کو استعمال کررہے ہیں۔ اس وجہ سے اس نظام بینک کاری کا اسلامی ہونا محلِ نظر ہوچکا ہے!! یہ تو ایک طرف اجتہاد، اجتہادی کوششوں اور اجتہادی قوت رکھنے والے اہل علم وعمل (تجربہ کار) کے فقدان کا نتیجہ ہے تو دوسری طرف غیر اسلامی اسالیبِ فکر وعمل کو سینے سے لگا کر طفل تسلی کے طور پر اسے اسلامی قرار دینا ہے۔

اوپر جس بینکنگ سسٹم کا ذکر کیا گیا ہے اس کی بنیاد 'خطرات' کی عادلانہ/منصفانہ تقسیم پر ہے۔



مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ یہ حضرات بینک میں سرمایہ بھی لگائیں گے اور ذاتی طور پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ گویا Sleeping Partner کا تصور ختم کرنا ہوگا، یعنی کمائی کے لئے محنت ضروری ہے۔

بینک کے ادارے

اس بینک میں موجودہ بینکوں کی طرح ادارے ہوں گے مثلاً 'A/cs 'Forex BG 'Lc وغیرہ ڈپارٹمنٹس، لیکن اس کے رسک اینڈ انفارمیشن (Risk & Information Dept.) کو ایسے لوگوں سے پر کرنا ہوگا جو بہت زیادہ بیدار مغز ہوں اور ملک اور بیرون ملک کی سیاسی، مالی، اقتصادی اور اجتماعی امور اور ان کے اندورن ملک قریبی اثرات بلکہ بعیدی اثرات کو گرفت میں لے کر ان کا گہرا تجزیہ کر کے اس کو اپنے بینک اور اس کے دونوں طرف دار.....امانت دار اور تاجر.....اور ان کے کاروبار پر اچھے یا برے یا ملے جلے اثرات تک ان کی گہری نظر پہنچتی ہو۔ علاوہ ازیں وہ حسابات کے اعداد وشمار کے پیچھے یا ان کے نیچے (Underline) چھپی ہوئی باتوں تک اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں پہنچنے کے صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں اور فوراً فیصلے کر کے انہیں نافذ بھی کر سکتے ہوں۔ یہاں سیدھے سادے ناواقف کار لوگوں کا گزر تک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ کیونکہ اس میں خود بینک کا اپنا سرمایہ بھی ڈوب سکتا ہے اور بالآخر یہ بات خود بینک کو بھی لے ڈوب سکتی ہے۔

ماڈل

بینک کے اکاونٹس تاجروں/ زرداروں اور خود پروجکٹس کی مدت کے مطابق ایک ماہ/ تین ماہ/ چھ ماہ/ سال/ دوسال/ تین سال/ چار سال/ پانچ سال کی مدت کے ہوں گے اور امانت داروں کو اسی مدت کے حساب سے اپنی رقمیں ڈپازٹ کرانی ہوں گی۔ بینک اس بات کا پابند ہوگا کہ اس مدت کی پابندی کرے اور اگر کبھی اس میں زیادتی کرنی پڑے تو امانت داروں کی منظوری لینی پڑے گی، مثلاً ایک ریفانری کے لئے ۵ سال کے

سرمایے کے ۲، ۳، ۴ سالوں کے امانت داروں کی امانتوں کو ملا کر سرمایہ مہیا کیا جاسکتا ہے تو امانت داروں کی منظوری ضروری ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

☆ چھ ماہ میں شروع ہو کر ختم ہونے والا ایک کاروبار ہے۔ اس میں ایک ملین ڈالر کا سرمایہ چاہیے۔ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی۔ ۳۰ % (امانت دار)، ۳۰ % بینک، ۴۰ % تاجر اور خطرات کی تقسیم کچھ اس طرح ہوگی:

۵۰ % تاجر، ۲۵ % بینک اور ۲۵ % امانت دار۔ چھ ماہ بعد تاجر نے بینک اور امانت داروں کے ۶۰ % سرمائے کے ساتھ ایک لاکھ ڈالر منافع کمایا۔ یہ منافع ۵۰ % تاجر کو ۲۵ % بینک کو اور ۲۵ % امانت داروں کو دیا جائے گا۔

☆ ایک ولڈنگ ورکشاپ قائم کرنے والا بینک سے قرض طلب کرتا ہے۔ بینک اس کے تجربہ، چال چلن وغیرہ کو دیکھ کر اسے قرض دینا طے کرتا ہے، مگر اس شرط پر کہ وہ ۲۵ % سرمایہ مہیا کرے۔

اس مقالے کو پڑھنے کے بعد برادر عزیز سید سعادت اللہ حسینی، رکن مرکزی مجلس شوریٰ، جماعت اسلامی ہند، نے سوال کیا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اگر کوئی صنعت کار/ صاحبِ حرفت اپنا ۲۵ %، ۳۰ % یا اس سے کم یا زیادہ حصہ مہیا کرنے سے عاجز رہے تو کیا ہوگا؟ میں نے عرض کیا کہ اس کو بینک/ امانت دار یا ان دونوں میں سے کوئی ایک قرض، ۵۰ % سے کم یا زیادہ فیصد نفع نقصان کی بنیاد پر اور مناسب ضمانت لینے کے بعد، دے سکتا ہے۔ یہ ایک الگ معاہدہ ہوگا جس کا ان تینوں ..... بینک، امانت دار، صاحب حرفت..... سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کاروبار میں نفع ہوا تو بینک/ امانت دار یا دونوں کو نفع کا ۵۰ % ملے گا (۳۰ %، ۲۰ %) باقی صاحبِ حرفت کا حق ہوگا۔ نقصان کی حالت میں اس نسبت سے ان کو صاحب حرفت کے ساتھ نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ باقی ۵۰ % میں بینک اور امانت دار ۳۵ %، ۳۵ % سرمایہ لگاتے ہیں۔ کاروبار میں منافع ۵۰ % ولڈر، ۵۰ % (بینک + امانت دار) طے ہوتا ہے۔ یہ ایک سال کا پروجکٹ تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد منافع کا حساب کتاب شروع ہوگا۔

کیونکہ ورکشاپ کھلنے کے دو چار ماہ تک آمدنی بہت تھوڑی ہوگی، جو ولڈر ہی کے لئے کافی ہوسکتی ہے، اس کے بعد ہی بینک اور امانت داروں کے منافعوں کا مطالبہ معقول ہوسکتا ہے۔

یہاں اور دوسرے منصوبوں میں بینک کو کاروبار کی رفتار اور ان کے چلانے کے ڈھنگ پر نظر رکھنی ہوگی ۔اس کے لئے بینک اپنے کسی ملازم کو ذمہ دار بنا کر اس کو نگراں مقرر کرسکتا ہے اور اس کا معاوضہ اخراجات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ معاوضہ ہر پروجکٹ کی متوقع آمدنی کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے جو اس کاروبار (Feasibility Study) میں مذکور ہوتا ہے ۔ بینک کے اس ملازم کا نہ صرف دیانت دار بلکہ اس خاص پیشہ میں تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھنے والا ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ کوئی اور مناسب شخص تلاش کرنا چاہیے۔

ان مثالوں پر بڑے بڑے پروجکٹس کو قیاس کیا جاسکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر سنڈیکٹ/کونساریٹم بھی سرمایہ کاری کی غرض سے بنائے جاسکتے ہیں ۔

بینک ان سارے معاملات میں خدمات کی فیس وصول کرتا رہے گا، جس کے ذریعہ وہ بلڈنگ کا کرایہ، اسٹاف کی تنخواہیں، فرنیچر وغیرہ کے اخراجات پورا کرے گا۔ یہ سود نہیں تصور کیا جاسکتا ہے اور حسب ضرورت اس میں کمی بیشی کا پورا امکان پایا جاتا ہے۔ یہ محنت کے مقابلے میں ہے، سود ہرگز نہیں ہے ۔

اب میں ان ذرائع/آلات میں سے ایک ایک پر بحث کروں گا جن کا ذکر ڈاکٹر اوصاف صاحب نے کیا ہے ۔

☆ **قانونی حفاظتی تناسب** : اس میں ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مطلوبہ حفاظتی تناسب میں شرح سود کی آمیزش کسی طرح بھی نہیں ہوتی (تحقیقات اسلامی ص: ۴۰) ڈاکٹر صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ اس رقم پر مرکزی بینک سود ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ایک بار اس پر غور کرلیں کہ یہ سودی نظامِ بینک کاری ہے اور مرکزی بینک اس کی بنیاد ہے اور اس کی محافظ (Protector) بھی ۔اگر وہ سود نہ دے اور نہ لے تو

یہ ہیکل خود بہ خود دھڑام سے زمین بوس ہوجائے گا۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ ملکی معیشتی ضروریات کے پیش نظر مرکزی بینک کسی خاص دائرۂ اقتصاد مثلاً صنعت، تجارت اور زراعت وغیرہ میں زرکاری کا بہاؤ بڑھانا چاہتا ہوتو اس نسبت کو مثلاً ۱۰% سے گھٹا کر ۵% یا ۲% یا صفر% تک کرسکتی ہے۔ بعض خاص حالتوں میں صفر فی صد سے آگے بڑھ کر اس کو مالی امداد میں بھی بدلا جاسکتا ہے، جسے سبسیڈی کہا جاتا ہے۔

☆ کھلے بازار کے اعمال (Open Market Operations):

اب چونکہ ہمارا مجوزہ بینکی نظام سرمایہ پر مبنی (Equity Based) ہے اس لیے اس میں قمار بازی (Speculation) کی بہت کم گنجائش ہے۔ اس لئے ہم ان ماہرین اقتصادیات کی رائے سے اتفاق نہیں کرسکتے ہیں جن کا خیال ہے کہ'' ان غیر سودی تمسکات کے پس پشت بنیادی خیال یہ ہے کہ تمسکات کسی اصل اثاثے یا اسی کے کسی جز (Real Asset) کی نمائندگی کریں گے اور کاملاً کسی مالی دعوے (Financial claim) کی خرید وفروخت پر مبنی نہیں ہوں گے'' (ص ۵۱) کیونکہ یہ دوسرے درجہ کی مارکیٹ (Sub Prime Market) میں صرف کاغذوں کی خرید وفروخت کو اس طرح رائج کرنے کا چور دروازہ بند ہوسکتا ہے، جیسا کہ رہن عقاری کے بحران میں پوری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔

اسلام کے ہر شعبہ کی طرح اس کے اقتصادی اور مالیاتی نظام کو بھی حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے، ورنہ ہم خود اپنے پیروں سے چل کر ان کھائیوں میں گر پڑیں گے جن میں سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ اقتصادی اور مالی نظام گر کر تباہ ہوئے ہیں اور انسانیت کو بھی تباہی کے دہانوں تک پہنچا چکے ہیں۔ ان میں ۵% یا ۱۰% سود لے کر ۹۰% یا ۹۵% قرض سے فیض یاب ہوا جاتا ہے اور ۵% یا ۱۰% احتیاطی تناسب کے بعد ۹۵% یا ۹۰% کے سہارے، بلکہ اعلیٰ قوت زر (High Power Money) کی فراہمی کرکے اور مضاعف تخلیق جمع (Multiple Deposit Creation) کا عمل (Process) رکھ کر تخلیقِ زر کی

جاتی ہے، جب کہ حقیقی پیداوار (Real Production) یا حقیقی آمدنیوں (Real Incomes) میں اس کے مقابلے میں اضافہ ہی نہیں ہوا ہے۔ اس کی بہترین مثال وہ کریڈیٹ کارڈس ہیں جن کو ایک ہی شخص کئی بینکوں سے حاصل کر لیتا ہے اور ان مصنوعی ذرائع سے مصنوعی طور پر معیار معیشت کو بلند کرنے کے جنون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔

آخرت کی کامیابی پر مناسب اور متوازن زور دینے کے بعد اور اعتدال کے ساتھ خرچ کرنے کی عادت ڈالنے اور عام اسلامی اخلاقی اور دینی معیارات (Norms) پر چلنے کی وجہ سے یقیناً اسلامی معیشت اور اس کا مالی نظام ویسا کچھ ہرگز نہیں ہوگا جیسا کہ ان حضرات کا خیال ہے جو سارے مغربی ڈھانچوں اور ذرائع وآلات کے ساتھ ان کے مالی اور اقتصادی معیارات (Norms) اپنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ حضرات بلاوجہ مغرب کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بجائے اسلام کی بنیاد اور اس کی عقائدی، عبادتی اور اخلاقی فضا کو موجودہ غیر اسلامی ماحول میں محسوس کر کے غور وفکر اور اجتہادانہ انداز اختیار کریں، نہ کہ تقلیدی Imitation کو اپنا سرمایہ سمجھیں۔

کھلے بازار کی سرگرمیوں کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس بازار کے ذریعہ ملکی سکّوں کی قیمت، غیر ملکی سکّوں کے مقابلے میں کم یا زیادہ کی جاتی ہے۔ اسلامی مرکزی بینک حسب ضرورت اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک آلے جیسی ہے، یہ کوئی اصول/ قانون نہیں ہے۔

☆ شرح سود: اس پر وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر اوصاف صاحب نے کہا ہے۔ البتہ 'سود مند' کے بجائے صحیح تر تعبیر 'اسلامی اقتصاد سے شرح سود کو کلیتہً خارج کر دیا جائے گا'' تا کہ 'سود مند' کے سود سے بھی کلیتہً نجات حاصل کی جا سکے۔

☆ قرض کی راشننگ (Credit Rationing): اس کے قابل عمل ہونے کے امکان سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حالات ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بظاہر ضرورتاً اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث

اسلامی بینکی نظام بحیثیت مجموعی اسلامی اقتصادی نظام کا جز ہوگا، جو کلیتًا سود سے پاک ہوگا، البتہ زرکاری (Investment) کے اغراض کے لیے کمپنیوں، بینکوں اور خود حکومت کو حصص جاری کرنے، خریدنے اور فروخت کرنے کے مواقع میسر ہوں گے، مگر ان سب سرگرمیوں کو ان کاغذی گھوڑوں سے نجات دلانی ہوگی جن کی بہترین مثال رہن عقاری کے دوسری درجہ کے مارکیٹ کے کاغذی دستاویزات اور پٹرول اور گیس کے 'کاغذی گھوڑے' ہیں جو حقائق .....اقتصادی اور مالی حقائق ..... کے سمندر میں صرف ڈوب کر مرتے ہیں اور جو اسٹاک مارکٹس کو بالکل نئی بنیادوں پر منظّم کرنے اور ان کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں چلانے ہی سے ممکن ہے۔ یہ کام صرف اور صرف اقتصادی اور مالی امور میں اسلامی مجتہدین ہی کر سکتے ہیں، جن کی نظر اسلامی نظام پر بہ حیثیتِ مجموعی کلی (Macro)، گہری اور دوررس ہو اور جو باہر کی دنیا سے تعلق اور ان کے اقتصادی اور مالی امور پر اثرات پر گہری نظر رکھتے ہوں۔

یہ سب کام، حتیٰ کہ اسلامی نظام کا قیام اور اس کو کامیاب انداز میں، ہر میدان میں، اندورنی اور بیرونی دشواریوں، فنی مخالفتوں اور سازشوں کے علی الرغم چلانا، مجتہدین مطلق کی ایک بڑی تعداد کا مطالبہ کرتی ہے جن کو جمع کرنا، تربیت دینا اور ہر ایک کو اس کے مناسب کام پر لگانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ یہ اپیل صدابہ صحرا نہیں ثابت ہوگی۔

اہم اعلان

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کچھ عرصہ سے اپنی ذاتی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ بہ راہ کرم اب درج ذیل پتے پر خط وکتابت کی جائے:

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر (جمال پور) پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

رسائل کے مدیران سے بھی گزارش ہے کہ وہ درج بالا پتے پر اپنے رسائل بھجوائیں۔

تعارف وتبصرہ

مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ناشر: نشریات، ۴۰-اردو بازار لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۹۸، قیمت درج نہیں

زیر نظر کتاب میں مکی عہد نبوی کا ایک خاص جہت سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ خطبات حیدرآباد ۲۰۰۳ء (جو 'مکی اسوۂ نبوی - مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل' کے نام سے اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکے ہیں) کا آخری باب تھا۔ مطالعہ نے وسعت اختیار کی تو اسے اس میں شامل نہ کر کے مستقل کتاب کی حیثیت دے دی گئی۔ مصنف کے بقول ''مسلم مفکرین نے مکی عہد نبوی میں دین وشریعت کے صرف بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات اور چند ضروری احکام کے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا اور اصل احکام اسلامی اور دین وشریعت محمدی کی تعمیر وتشکیل کا زمانی ومکانی نظریہ پیش کیا کہ وہ سب مدنی دور کی دین ہیں'' (ص II-III) اس کے برخلاف مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ ''تمام بنیادی احکام مکہ میں آ چکے تھے اور مدینہ منورہ میں ان پر جزوی اضافات اور تکمیلی تعمیرات ہوتی رہیں'' (ص III) بالفاظ دیگر ''دین وشریعت اسلامی پوری کی پوری مکی دور ہی میں رسول اکرم ﷺ کو عطا کر دی گئی تھی۔ مکی اسلام اصل ہے اور اسی پر مدنی اسلام کا انحصار ہے۔ دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں'' (ص IX)۔

کتاب کی ابتداء میں فاضل مصنف نے 'مکی اسلام کی تفہیم - مسائل وجہات' کے عنوان سے اپنے نقطۂ نظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ بحث ۳۶ صفحات پر محیط ہے۔ آگے انھوں نے طہارت، نماز، زکوٰۃ وصدقات، روزہ، حج وعمرہ، نکاح وطلاق، ولادت ورضاعت، وفات وجنازہ، ماکولات ومشروبات، معاملاتِ تجارت ومعیشت، حدود وتعزیرات، آدابِ معاشرت، احکامِ وجوب وسنت اور احکامِ تحریم وکراہت کے ابواب کے تحت پوری کتاب میں شواہد جمع کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں مسلمانوں کو بنیادی احکام مکی عہد ہی میں دے دیے گئے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان پر صرف جزوی اضافات اور تکمیلی تعمیرات ہوتی رہیں۔ مصنف

کو احساس ہے کہ 'شواہد کا انبار' لگانے میں بسا اوقات 'طولِ کلام' اور 'تکرار کا عیب' پیدا ہوگیا ہے، لیکن ایسا مجبوراً کیا گیا ہے (ص X) ان کا انداز بحث یہ ہے کہ ہر باب میں پہلے انھوں نے سابقہ ملتوں اور خاص کر دین ابراہیمی کا حکم وعمل بیان کیا ہے، پھر مکی عہد میں اس کا تسلسل اور ارتقاء دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور تعاملِ صحابہ سے استدلال کیا ہے۔ بعض احکام صرف مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں مذکور ہیں۔ ان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ بھی اصلاً مکی احکام ہیں، عہد مکی میں ان پر عمل ہوتا رہا ہے، بعد میں ان کا تذکرہ یا اعلان ونفاذ مدنی آیات میں کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کا نزول پورے عہدِ نبوی میں حسبِ ضرورت ہوتا رہا ہے اور وہ ارتقا کے مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ بہت سے احکام مکی دور میں دیے گئے تو دیگر بہت سے احکام مدینہ میں بیان کیے گئے۔ مثال کے طور پر قصاص، دیت، حدود، تعزیرات اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے احکام تمام تر مدنی دور کے ہیں۔ ان کی اصل مکی دور میں تلاش کرنا خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ ایسے تکلّفات کی مثالیں زیرِنظر کتاب میں کثرت سے ہیں، مثلاً فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ مکی عہد میں نماز کے علاوہ روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی فرض ہو چکے تھے۔ اس پر انھوں نے مفصّل بحث کی ہے اور بہت سے دلائل دیے ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ 'اگر عام خیالِ علماء تسلیم کرلیا جائے اور ان پانچوں ارکان کی مکی دور میں تکمیل وتنزیل کا قاعدہ اور حقیقت نہ تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مکی دور میں اسلام ناقص تھا، کیوں کہ وہاں اس خیال خام کے مطابق صرف ایمان ونماز ہی قائم ہوئے تھے۔ روزہ مدنی دور کے ۲ھ میں اور زکوٰۃ ۳ھ میں واجب ہوئے، گویا کہ ان دونوں زمانوں تک بھی مدنی اسلام ناقص ہی رہا۔ اور اگر حج کی فرضیت کے بارے میں مقبول ومشہور خیال تسلیم کرلیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اسلام ۹ھ/ ۱۰ھ تک ناقص رہا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حدیث **بنی الاسلام علی خمس** ... الخ کس زمانے کی ہے؟'' (ص VIII-IX) آگے انھوں نے یہ بحث 'حدیث ارکانِ اسلام سے استشہاد' کے زیرعنوان بھی اٹھائی ہے (ص ۲۶۴-۲۶۶)۔ اولاً مکی دور میں تمام ارکانِ

اسلام کی فرضیت کی دلیل کے طور پر اسلام کے کمال ونقص کی بحث اٹھانا صحیح نہیں۔جس زمانے تک اللہ کے جتنے احکام نازل ہوئے، وہی مکمل اسلام تھا۔ بعد میں کچھ اور احکام کا اضافہ ہوا تو وہ بھی دائرۂ اسلام میں شامل ہوگئے۔ثانیاً حدیثِ مذکور میں ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن صوم رمضان ہے، نہ کہ مطلق صوم۔اور مصنف بھی قائل ہیں کہ صوم رمضان کی فرضیت مدنی دور میں ہوئی ہے۔ ثالثاً یہ مان لینے میں کیا حرج ہے کہ حدیث مذکور مدنی دور کی ہے، جب پانچوں ارکان اسلام فرض ہو چکے تھے۔

اسی طرح حرمتِ شراب سے متعلق فاضل مصنف کی بحث (ص۳۶۴-۳۷۰) بھی تبصرہ نگار کے نزدیک محض خیال آفرینی ہے۔شراب کی تحریم کا اعلان مدینہ منورہ میں ہوا۔مکی عہد میں بہت سے صحابہ اس کا استعمال کرتے تھے۔اسی بنا پر اہل علم اور شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں شراب حلال تھی۔مگر فاضل مصنف کہتے ہیں کہ ''اصلِ تحریمِ خمر ازلی اور مکی ہے اور اس کا علان ونفاذ متاخر اور مدنی ہے''۔تبصرہ نگار عرض کرتا ہے کہ حرام وحلال اسلام کی خالص قانونی اصطلاحات ہیں۔کسی حرام کا ارتکاب موجبِ گناہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شراب میں اثم (ضرر) کا پہلو نمایاں ہے، عہدِ جاہلی میں بعض صالح فطرت لوگ اس سے اجتناب کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ اور بعض اکابر صحابہ نے عہد مکی میں کبھی اسے ہاتھ نہ لگایا، سفر معراج میں آپؐ نے جام شراب کے بجائے دودھ کے پیالہ کو ترجیح دی، لیکن عہد مکی میں بہرحال شراب حرام نہ تھی۔اسی بنا پر بہت سے صحابہ اس کا استعمال کرتے تھے۔عہد مدنی میں اسے حرام قرار دیے جانے کے بعد صحابہ کرام نے اس سے کلّی اجتناب کیا اور اگر کسی نے ہاتھ لگایا تو اسے سزا دی گئی۔

کتاب کے مرکزی موضوع سے ہٹ کر بھی مصنف کے متعدد نتائجِ بحث سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، مثلاً احادیث میں ہے کہ رمضان المبارک کی ہر شب حضرت جبرئیل علیہ السلام آں حضرت ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتے تھے اور اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔اس کے لیے 'معارضة' اور 'مدارسة' کے الفاظ آئے ہیں (بخاری: ۶، ۱۹۰۲، ۳۲۲۰، ۳۵۵۴، ۴۹۹۷)۔ مذاکرہ کی نوعیت کے بارے میں

فاضل مصنف نے لکھا ہے: ''مذاکرہ و مدارسۃ کا مفہوم ان معنوں میں بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ اس سے صرف قرآن مجید کے نازل شدہ حصوں کا دہرانا مراد لیا ہے، حالاں کہ وہ بہت وسیع و عریض معانی و مفاہیم کا حامل ہے۔ اس میں تکرار سے زیادہ تعلیم و تفسیر اور تدریس و تفہیم کے دوسرے ابعاد و جہات شامل ہیں''۔ (ص ۱۶۳) 'مذاکرہ' کے مفہوم کو اس قدر وسیع کر دینا صحیح نہیں۔ الفاظِ قرآن کے دہرانے کا محدود معنیٰ لینا ہی درست ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: "المعارضة مفاعلة من الجانبين كأن كلاّ منهما كان تارة يقرأ و الآخر يستمع (فتح الباری، دارالمعرفۃ بیروت، ۹/۴۳) "فيدارسه القرآن" فان ظاهره ان كلا منهما كان يقرأ على الآخر وهى موافقة لقوله "يعارضه" (ایضاً، ۹/۴۵) صحیح بات یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کا کام صرف 'وحی قرآنی' پہنچا دینا تھا، اس کی تفسیر بیان کرنا، مفہوم واضح کرنا اور تعلیم و تدریس کا کام انجام دینا ان کا منصب نہ تھا۔

زیرِ نظر کتاب سیرتِ نبوی کے ایک اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔ ہندوستان میں یہ صفا شریعت کالج، سدھارتھ نگر (یوپی) کے زیر اہتمام فرید بک ڈپو نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ فاضل مصنف کی تحقیقاتِ عالیہ فکر و نظر کے دریچے کھولتی ہیں۔ ان کا قلم رواں دواں ہے اور سیرت کے نئے نئے موضوعات پر عاشقانِ رسول کی تسکین کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ امید ہے بہت جلد ان کی نئی تصنیف 'عہد نبوی میں تمدن' منظرِ عام پر آئے گی، جس کا زیرِ نظر کتاب کے بعض حواشی میں تذکرہ آیا ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

نقوش سیرت — مولانا محمد رابع حسنی ندوی

ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنو، صفحات: ۲۰۸، قیمت: درج نہیں

اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کے بعد جتنا علمی کام پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی سیرت پر ہوا ہے اُتنا کسی اور موضوع پر نہیں ہوا۔ چودہ سو سال سے زائد عرصے سے سیرت النبی ﷺ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر برابر کام ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک

بحر ناپیدا کنار ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے علما کا یہ ایک پسندیدہ اور عشق ومحبت سے لبریز موضوع رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'نقوش سیرت' بھی سیرت نبویؐ کے مختلف گوشوں سے بحث کرتی ہے۔ یہ دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے مختلف مواقع پر مختلف رسائل کے لیے لکھے تھے۔ یہ کتاب مولانا کے ۲۶ مضامین کے علاوہ مقدمہ (نگاہ اولین از مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم) اور تعارف بہ عنوان نقوش سیرت- ایک مطالعہ (پروفیسر وصی احمد صدیقی) پر مشتمل ہے۔

پوری کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اور پاکیزہ زندگی، رواداری، عدل و انصاف، اعتدال، عزم و ہمت، برداشت اور صبر، بہادری اور شفقت، عاجزی اور انکساری، اپنے صحابہ سے محبت اور دلی وابستگی، رقیق القلبی اور خشیت الٰہی کا بھرپور تعارف کراتی ہے۔ مطالعۂ کتاب کے دوران قاری کے اندر حُب رسول کا جذبہ اور عملی دنیا میں ویسا ہی کردار پیش کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ خوشی اور غم میں نبی کریم ﷺ کے اعتدال کی عمدہ مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

یہ کتاب مختلف مواقع پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، اسی لیے بہت سے واقعات کی کئی مضامین میں تکرار ہوئی ہے۔ اسی طرح بعض آیات بھی کئی کئی بار آئی ہیں۔ کتاب کا انداز تحریری سے زیادہ تقریری ہے۔ ان مضامین کو کتابی صورت میں مرتب کرتے وقت اگر مناسب تدوین کر لی جاتی تو ان کا حسن دوبالا ہوجاتا۔

یہ مضامین اپنی افادیت اور سلاست کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ سادہ اور عام فہم عبارت اور سہل انداز بیان ہے جس سے دل میں سیرت نبوی کے تعلق سے گرم جوشی پیدا ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مضامین میں عمدہ اور بے مثال موتیوں کا ڈھیر ہے۔

شرط ہے کہ اخلاص کے ساتھ تزئین اخلاق کا جذبہ ہو۔ کتاب اس لائق ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے اور عام مجلسوں میں اس کے مضامین کو سُنایا جائے۔

(مجاہد شبیر فلاحی)

عربی تنقید کا ارتقاء پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

ناشر: فیض المصنفین، مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص۲۱۲، قیمت -/۱۵۰ روپے

فن تنقید کا شمار قدیم ترین فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ غالبا دنیا کی ہر زبان میں اس کا قابل قدر سرمایہ پایا جاتا ہے۔اس فن کی قدیم ترین روایات ہمیں یونانی زبان میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد عربی زبان ہے، جس میں تنقید کا فن اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس میں فن تنقید کے آثار ہمیں عہد جاہلیت ہی سے نظر آتے ہیں، لیکن وہ فنی حیثیت اختیار نہ کر سکے تھے، کہ وہ اشعار اور شعراء کے متعلق ناقدین کی ذاتی و شخصی آراء تھیں۔صدر اسلام اور عہد اموی میں فن تنقید نے ارتقائی مراحل طے کیے، لیکن فنی حیثیت سے اسے وہ مقام و مرتبہ نہ حاصل ہو سکا جس پر وہ عہد عباسی میں فائز ہوا کہ اسی عہد میں تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث پروان چڑھے۔

زیر مطالعہ کتاب عربی تنقید کی عہد بعہد تاریخ اور اس کے مختلف ارتقائی مراحل کا ذکر کرتی اور خاص طور عصر عباسی میں اس کے مختلف مظاہر کو بیان کرتی ہے۔ دراصل یہ فاضل مصنف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، جسے انھوں نے عربی زبان میں لکھا تھا، پھر اپنے نگراں پروفیسر عبدالعلیم خاں، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشورہ پر عمومی فائدہ کی خاطر اسی زمانے میں اسے اردو کا قالب بھی پہنا دیا تھا، لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اب تک شائع نہ ہو سکی تھی، تقریباً چالیس سال بعد اب منظر عام پر آئی ہے۔ اسے فاضل مصنف کے سلسلۂ تنقیدات کے حصۂ چہارم کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس سے پہلے تمہیدی طور پر 'عربی تنقید اور اس کے ارتقائی مراحل' کا سرسری ذکر ہے۔

پہلے باب میں عصر عباسی سے قبل عربی تنقید کے مظاہر سے بحث کی گئی ہے۔ان میں عہد جاہلیت، صدر اسلام اور اموی عہد میں پائے جانے والے تنقیدی آثار اور اس کی فنی قدر و قیمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ باب نسبتاً مختصر ہے۔ دوسرا باب عہدِ عباسی میں عربی تنقید کے ارتقاء کو بیان کرتا ہے۔اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی تنقید کے مختلف

مظاہر کو عرب شعراء کے تذکروں پر مشتمل کتب کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب ادبی کتابوں میں تنقیدی افکار کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ غالبًا اولین کاوش ہے جس میں ادبی کتابوں کی روشنی میں عربی تنقید کے نظریات کو تلاش کر کے انھیں مرتب کرنے اور ان کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں اسامہ بن منقذ (م۵۸۴م) کی **البـديـع في نقد الشعر** کا ذکر نہیں ہونا چاہیے تھا کہ یہ کتاب تنقید کے موضوع سے بحث کرتی ہے، جب کہ اس باب میں ادبی کتب میں پائے جانے والے تنقیدی افکار ونظریات کو بیان کرنا مقصود تھا۔ چوتھا باب نثر کی تنقید ہے۔ اس میں خطبات اور رسائل کی تنقید کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب 'ادبی تنقید کے ارتقاء میں قرآن کریم کا حصہ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ادبی تنقید پر قرآن کریم کے اثرات پر بہت ہی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹا باب عہدِ عباسی کے اہم ناقدین اور ان کی کتبِ تنقید کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ کتاب کا بنیادی حصہ ہے جس میں عہدِ عباسی کے تنقیدی رجحانات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں عہدِ عباسی کے اہم ناقدین کی کتب کا جائزہ اس انداز سے لیا گیا ہے کہ ان کے رجحانات اور میلانات کے ساتھ ان کے محاسن ومعایب کا بھی پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ باب ہفتم میں عربی تنقید کے بنیادی مباحث کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ باب ہشتم میں عربی تنقید کے عربی، یونانی اور بلاغی مکاتب فکر کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مجموعی طور پر اردو زبان میں لکھی جانے والی کتب تنقید میں اہم مقام ومرتبہ کی حامل ہے۔ اسے پڑھ کر عربی تنقید کے مختلف مراحل، اس کے افکار ونظریات اور اصولی مباحث کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کا سب سے بڑا نقص پروف ریڈنگ کی غلطیاں ہیں، حتی کہ کتابوں کے نام کے علاوہ حوالہ جات کی بھی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں اصل مراجع تک پہنچنا عام قاری کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح کتاب کے ظاہری حسن میں بھی متعدد خامیاں ہیں۔ مثلاً کتاب کا تیسرا اور چوتھا باب نئے صفحہ کے بجائے اس جگہ سے شروع ہوجاتا ہے جہاں دوسرا و تیسرا

باب ختم ہوتا ہے۔فہرست میں باب ششم کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے،لیکن متن کتاب میں یہ تقسیم موجود نہیں ہے۔ اسی طرح فہرست کے ذیلی عناوین میں بعض شخصیات کا نام مذکور نہیں ہے،لیکن متن کتاب میں ان کے نظریات سے بحث کی گئی ہے۔

امید ہے موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے درمیان اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (جمشید احمد ندوی)

شاہ معین الدین احمد ندوی- حیات وخدمات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر: ادبی دائرہ اعظم گڑھ یوپی، ملنے کا پتا: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،صفحات:۱۹۶، قیمت-/۱۰۰روپے

دارالمصنفین اعظم گڑھ نے اپنے زمانۂ تاسیس ہی سے علم وادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ ہند کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ اِس ادارہ کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ایسی شخصیات کی سرپرستی اور خدمات حاصل ہوتی رہیں جنھوں نے نہ صرف تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ، علم کلام، سیر وسوانح اور ادبی موضوعات پر ناقابلِ فراموش تحریروں کا ذخیرہ چھوڑا بلکہ وقت کے اہم اور حسّاس موضوعات ومسائل پر قلم اٹھایا اور اسلامیانِ ہند کی رہ نمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ان اہم اور مقتدر شخصیات میں سے ایک مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ہیں ،جنھوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد دارالمصنفین کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۷۴ء میں اپنی وفات تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ندوہ سے فراغت کے بعد ہی آپ نے دارالمصنفین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور کم وبیش نصف صدی تک اس ادارے سے منسلک رہے ۔اس اثنا میں جہاں آپ نے تاریخِ اسلام ، سیر الصحابہ، تابعین، حیات سلیمان، اسلام اور عربی تمدّن ،عرب کی موجودہ حکومتیں اور عربی نقوش جیسی وقیع اور بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں وہیں ماہ نامہ 'معارف' کی وساطت سے اہم قومی اور ملی مسائل پر بھی خامہ فرسائی کی۔ان مقالات میں انھوں نے جہاں اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو ہند اور جمعیۃ العلماء جیسے اہم قومی وملی

اداروں کے مسائل کو اجاگر کیا وہیں اپنے زمانے کے اہم نظریاتی مسائل مثلاً قومیت، کمیونزم، آزادی، زمین داری اور فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ پر بھی قلم اٹھایا اور زندگی کی آخری سانس تک قلمی جہاد میں مصروف رہے۔

مختصر یہ کہ شاہ صاحب کی شخصیت بڑی جامع اور متنوع تھی۔ وہ ایک تذکرہ نگار، مورخ، ادیب، نقاد اور سخن فہم وسخن سنج عالمِ دین تھے۔ ایسی اہم اور جامع کمالات شخصیت کی زندگی قلم کا موضوع بنائے جانے کی مستحق تھی، مگر عرصے سے یہ خدمت علمی دنیا پر قرض تھی۔ خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی میں ان کی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا اور مختصراً سہی، اس کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی کوشش کی۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب شاہ صاحب کے نجی حالاتِ زندگی پر ہے۔ بعد کے ابواب میں ان کی تصنیفات کا تعارف نیز شخصیت کے مختلف علمی پہلوؤں کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً تذکرہ نگاری، تاریخ نگاری، ادب وتنقید، افکار وخیالات اور اسلوب ونگارش وغیرہ۔ آخری اور آٹھویں باب میں مشاہیر کے نام ان کے خطوط نقل کیے گئے ہیں۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنی آخری زندگی میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے بیعت ہوگئے تھے۔ مکاتیب کے باب میں مرتبین کی عام روش یہی رہتی ہے کہ وہ اس میں ذوق انتخاب سے قطعاً کام نہیں لیتے اور اگر پارسل یا منی آرڈر کی رسید وغیرہ بھی مل جائے تو اسے تبرکاً نقل کردیتے ہیں، حالاں کہ خطوط وہی شائع کرنے چاہیے جن میں کوئی علمی، فکری یا سماجی مسئلہ یا نکتہ ہو۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ آغازِ کتاب میں بعض اہم اہلِ قلم مثلاً ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر خورشید نعمانی کی تقریظات اور پیش لفظ بھی شامل ہیں۔

حاصل یہ کہ یہ کتاب ایک جامع کمالات شخصیت کی حیات اور علمی خدمات کا بہت اچھے انداز میں تعارف کراتی ہے اور موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔ (جاوید احسن فلاحی)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۳۰)

☆ ادارہ کی سرگرمیوں کا ایک اہم جزء عصری اہمیت کے حامل علمی موضوعات پر وقتاً فوقتاً توسیعی خطبات کا انعقاد ہے۔ اس کے تحت ۱۶/ نومبر ۲۰۰۸ء کو 'نظریۂ ارتقائیت (Evolutionism) اوراس کے چند اہم مضمرات' کے عنوان پر ڈاکٹر کنور محمد یوسف امین، پروفیسر شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا توسیعی خطبہ ہوا۔ مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی نے صدارت فرمائی۔ لیکچر کے بعد اس پر مذاکرہ ہوا جس میں سامعین نے سرگرم حصہ لیا۔ پروگرام میں مسلم یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم اور دیگر شائقین نے شرکت کی۔

☆ شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارۂ علومِ اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام گزشتہ آٹھ سال سے ہر سال شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی علمی خدمات کے کسی نہ کسی پہلو پر سمینار ہورہا ہے۔ امسال ۱۴- ۱۵ نومبر ۲۰۰۸ء کو 'شاہ ولی اللہ- حیات اور تصانیف' کے موضوع پر دوروزہ سمینار منعقد ہوا، جس میں مسلم یونی ورسٹی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف دینی مدارس، عصری جامعات اور علمی مراکز سے وابستہ اہل علم نے شرکت کی۔ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے سمینار میں حصہ لیا اور 'شاہ ولی اللہ کی تصنیف 'فتح الخبیر بما لابدّ من حفظہ فی علم التفسیر'- تعارف وتجزیہ' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

☆ الحمدللہ ادارہ کا 'تصنیفی تربیت پروگرام' جاری ہے۔ حال میں نئے بیچ (Batch) نے جوائن کرلیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت دینی مدارس اور عصری جامعات کے فارغین کو دینی موضوعات پر مطالعہ وتحقیق اور تحریر وتصنیف کی تربیت دی جاتی ہے۔

☆ ادارہ کی موجودہ عمارت کی پہلی منزل کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے خطیر مصارف کی ضرورت ہے۔ اہلِ خیر سے اس جانب توجہ کرنے کی درخواست ہے۔